(افسانوں کا مجموعہ)

سلام بن رزاق

کہانی پبلی کیشنز

۹/۱ ایل۔ آئی۔ جی۔ ونوبا بھاوے نگر
کرلا (مغرب) بمبئی۔ ۴۰۰۰۷۰

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اُتّرپردیش، لکھنؤ کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی ۔

انتساب

اپنی

بیٹی شگفتہ

کے

نام

بار اوّل دسمبر ۱۹۸۷ء

کتابت :- شیخ عبدالرحمٰن

سرورق :- طارق شرار

ناشر :- سلام بن رزاق

طباعت :- ھُدیٰ آفسیٹ پریس
محمد علی روڈ۔ مالیگاؤں

قیمت ۲۵ پچیس روپے

تقسیم کار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
اُردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶
یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

سیفی بک ایجنسی ۱۱ آمین بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ،
بمبئی ۴۰۰۰۰۳

ترتیب

ندی

ندی بہت بڑی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا پاٹ کافی چوڑا رہا ہوگا۔ مگر اب تو بے چاری سوکھ ساکھ کر اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب اس کے دونوں کناروں پر تاڑ اور ناریل کے آسمان گیر درخت اُگے ہوئے تھے جن کے گھنے سائے ندی کے گہرے، شانت اور شفّاف پانی میں یوں ایستادہ نظر آتے جیسے کسی پُرجلال بادشاہ کے دربار میں مصاحب سر نیوڑھائے کھڑے ہوں۔ مگر اب درختوں کی ساری شادابی لُٹ چکی تھی اور ان کے ٹُنڈ مُنڈ خشک صورت تنے کسی قحط زدہ علاقے کے بھوکے کنگال لوگوں کی طرح بے رونق اور نادار لگ رہے تھے۔

ندی بہت بڑی تھی اور اُس کا پاٹ اب بھی اپنی گزری ہوئی عظمت اور وسعت کی غمّازی کرتا نظر آتا۔ مگر اب اس طرح خشک ہو گئی تھی کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے بے ڈھنگے ٹاپو اُبھر آئے تھے۔ حدِ نظر تک چھوٹے بڑے بے شمار ٹاپو۔

اب اُن ٹاپوؤں پر کہیں کہیں خود رو گھاس اور جنگلی جھاڑیاں بھی اُگ آئی تھیں۔ جن میں ہزاروں لاکھوں ٹڈے اور جھینگر شب و روز پُھدکتے رہتے۔ گھاس کے نیچے کیچڑ میں لاکھوں کیڑے رینگتے کلبلاتے رہتے اور جب دوپہر کی تپا دینے والی دھوپ میں کم کم گدلا بدبودار پانی تپنے لگتا تو ندی کی مچھلیاں اس طرح اِدھر اُدھر مُنہ چھپاتی پھرتیں جیسے کسی پردہ دار گھرانے کی بہو بیٹیاں بھرے بازار میں بے نقاب کر دی گئی ہوں۔ مچھلیوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی اور ٹڈے، جھینگر، کیڑے مکوڑوں اور مینڈکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوپہر ڈھلے ندی کے نیم گرم، گدلے پانی سے چھوٹے بڑے بے شمار مینڈک نکلتے

اور اُن ٹاپوؤں پر بیٹھ کر ٹرّاتے رہتے ۔ ہر ٹاپو پر ایک بڑے مینڈک کا قبضہ تھا اور ہر ایک کے چھوٹے چھوٹے سیکڑوں معتقد یا حلقہ بگوش تھے ۔ جو ہر دم اُس کی ٹرّاہٹ کی تائید میں خود بھی ٹرّاتے رہتے ۔

"میں اس ندی کا وارث ہوں"۔ بڑا مینڈک ۔

"ہاں، آپ اس ندی کے وارث ہیں"۔ چھوٹے مینڈک ۔

"اس ندی کے ایک ایک ٹاپو پر میرا اختیار ہے"۔

"اس ندی کے ایک ایک ٹاپو پر آپ کا اختیار ہے"۔

"میں ـــــ میں ـــــ چاہوں تو"۔

بڑا مینڈک مناسب دعوے کے لیے آنکھیں مٹکا مٹکا کر ادھر اُدھر دیکھتا اور ذرا سے توقف کے بعد کہتا۔

"میں چاہوں تو ایک جست میں اس چمکتے سُورج کو آسمان سے نوچ کر پاتال میں پھینک دوں"۔

"آپ چاہیں تو ..... " چھوٹے مینڈک دھوپ سے اپنی آنکھوں کو بچاتے ہوئے حسبِ عادت بڑے مینڈک کی تائید کرتے کہ بڑے مینڈک کی خوشنودی ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا ۔

پھر پاس ہی کے کسی ٹاپو سے ایک موٹے پیٹ اور پتلی ٹانگوں والا کوئی بڑا مینڈک گمبھیر آواز میں اپنے کسی معتقد سے پوچھتا ۔

"کون ہے یہ ؟ کون ہے یہ احمق ؟"

ایک طرار مینڈک پھُدک کر کہتا ۔

"وہی ہمارا ذلیل پڑوسی ہے ۔ جس کے اجداد حضور کے کفش بردار رہ چکے ہیں"۔

"اوہو، اس نمک حرام سے کہو کہ سورج پر کمند ڈالنے سے پہلے ہمارے قدم چومے کہ خورشید ہمارے نقشِ کفِ پا کے سوا کچھ نہیں"۔

اس کی لن ترانی کے جواب میں کسی تیسرے ٹاپو سے آواز آتی ۔

"یہ کون گستاخ ہے ۔ اسے آگاہ کر دو ، اپنی زبان کو قابو میں رکھے کہ ہم زبان درازوں کی زبانیں یوں کھینچ لیتے ہیں جیسے ملکُ الموت جسم سے رُوح"۔

"خاموش ، خاموش اس ندی کا ایک ایک ٹاپو ہماری زد میں ہے"۔

اس کے بعد ہر ٹاپو سے ایک نئی آواز بلند ہونے لگتی۔ ہر آواز پہلی آواز سے زیادہ تیز، ہر دعویٰ پہلے دعوے سے زیادہ بلند و ارفع۔ ایسا شور مچتا کہ بے چاری مچھلیاں خوفزدہ ہو کر چٹانوں کی تہوں میں جا چھپتیں۔ درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے پھڑپھڑا کر اڑتے اور جدھر جس کا سینگ سماتا چلا جاتا۔ ٹرا ٹرا کر مینڈکوں کے گلے رندھ جاتے، پھول پھول کر پیٹ پھٹ جاتے، اور بیسوں مینڈک اپنے ہی بلند بانگ دعووں کے وزن تلے دب دب کر کچل جاتے۔ اور پھر دھیرے دھیرے تمام ٹاپوؤں پر ایک خوفناک سکوت طاری ہو جاتا، کسی مینڈک کی ٹرٹر، کسی جھینگر کی چھائیں چھائیں۔ مگر یہ سکوت ایک مختصر سے وقفے کے لیے ہوتا۔ دوسرے دن پھر مینڈک اپنے اپنے ٹاپوؤں پر جمع ہوتے اور پھر وہی لاف گزاف۔

ایک دن اسی طرح بڑے چھوٹے مینڈک اپنے اپنے ٹاپوؤں سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے، ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ذلیل کر رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے۔ مچھلیاں چھوٹے چھوٹے چٹانوں میں اوپری سطح پر تیرتی اس لڑائی کو خوف اور حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے گھاس اور پودوں کی جڑوں میں دبک گئے تھے۔ ندی کے کنارے پھدکتی چڑیاں دم بخود اس بحث کو سن رہی تھیں۔

تبھی ندی کے ایک گوشے میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ پہلے تو سطح آب پر بڑے بڑے بلبلے پیدا ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کوئی پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔ یہ ایک بیحد بوڑھا مگرمچھ تھا۔ اتنا بوڑھا کہ اس کی کینچلیاں جھڑ چکی تھیں۔ دم کے دانتے کند پڑ گئے تھے اور اس کی پشت پر باریک باریک سبزہ اُگ آیا تھا۔ اُس نے اپنی پوری قوت سے دُم کو اس کیچڑ آلود پانی کی سطح پر دے مارا۔ ایک زور کا چھپاکا ہوا اور پانی کے چھینٹے اڑ کر دُور دُور تک پہنچے۔ مختلف ٹاپوؤں پر شور مچاتے مینڈک یک بیک چپ ہو گئے۔ سب اپنی پچھلی ٹانگوں پر اُچک اُچک کر اس آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ آخر سبوں نے بوڑھے مگرمچھ کو دیکھ لیا۔ سبھی مینڈک بوڑھے مگرمچھ کا بیحد احترام کرتے تھے بلکہ بعض اس سے خوف زدہ بھی رہتے تھے۔ کیونکہ اُن کے آبا و اجداد کے مطابق بوڑھا مگرمچھ اس ندی کی بدلتی ہوئی تاریخ کا چشم دید گواہ تھا۔ اس کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ہستی صدیوں کے دوش پر قرنوں کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔

تمام مینڈکوں نے ٹرا ٹرا کر بوڑھے مگرمچھ کی جے جے کار کی۔ بوڑھے مگرمچھ نے اپنی بھاری دُم پٹک کر اور اپنا لمبا چوڑا جبڑا کھول کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر رینگتا ہوا ایک اونچی چٹان پر چڑھ گیا۔

چٹان پر پہنچ کر اس نے ندی کے اطراف نگاہ ڈالی ۔ اب ندی ـــ ندی کہاں تھی ؟ وہ تو بس چند ٹاپوؤں اور چہ بچوں کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی ۔ جگہ جگہ ریت کے خشک تودے اُبھر آئے تھے ۔ کہیں کہیں گڑھوں میں پانی کے بجائے صرف کیچڑ تھا ۔ ندی کے دونوں کناروں پر خود رو گھاس ضرور اُگی ہوئی تھی مگر پانی کی کمی کے کارن گھاس کا رنگ بھی زرد پڑتا جا رہا تھا ۔ ناریل ، سپاری اور تاڑ کے درخت بانس کے جنگل کی طرح خشک اور ویران لگ رہے تھے ۔ ندی کی اس بدلی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر مگرمچھ کا دل بھر آیا ۔ قریب تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہہ نکلتے ۔ اس نے کمالِ ضبط سے اُن آنسوؤں کو روکا ۔ مبادا ندی کے یہ بے ضمیر باسی انھیں حسبِ روایت مگرمچھ کے آنسو کہہ کر ان کی تضحیک نہ کریں پھر اس نے اپنے دیدے گھما کر اِدھر اُدھر ٹاپوؤں پر بیٹھے مینڈکوں کو دیکھا ۔ سارے مینڈک دم سادھے بیٹھے تھے ۔ مگرمچھ نے پھنکار کر گلا صاف کیا ، پھر بھرائی آواز میں بولا :

" اے ندی کے باسیو ! کبھی تم نے اس بلند چٹان سے ندی کو دیکھا ہے ؟ "

تمام مینڈک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ۔ پھر سبوں نے بیک زبان اعتراف کیا ۔

" نہیں ـــ ہم نے اس بلند چٹان سے کبھی ندی کو نہیں دیکھا ۔ "

" دیکھو ! یہاں سے ندی کو دیکھو تو تم پر تمھارے بے بضاعت ٹاپوؤں کی حقیقت آشکار ہو جائے گی ۔ "

" مگر ہم وہاں سے ندی کو کیوں دیکھیں کہ ندی تو ہمارے لہو میں جاری و ساری ہے ۔ "

" عریاں حقیقتوں کو سیمابی لفظوں کا لباس نہ پہناؤ کہ الفاظ جذبے کے اظہار کا بہت ادنیٰ ذریعہ ہیں ۔ خود تسلّی ، عارضی اطمینان کی سبیل ضرور ہے مگر یہی اطمینان مکمل تباہی کا پہلا بگل بھی ہے ۔ "

تبھی ایک کونے سے ایک پستہ قد زرد فام مینڈک نے ٹرّا کر کہا :

" میں دیکھ سکتا ہوں ـ بلندی سے میں ندی کا نظارا کر سکتا ہوں ۔ "

تمام مینڈک اُس زرد فام مینڈک کی طرف مُڑے ـ وہ پندرہ بیس مینڈکوں کے کاندھوں پر چڑھا سینہ پھلائے نہایت حقارت سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ پھر اس نے مگرمچھ سے مخاطب ہو کر کہا :

" اے دانائے راز ! کیا میں ان تمام سفالی ہستیوں سے سر بلند نہیں ہوں کہ یہ ندی کراں تا کراں میری نگاہ کی زد میں ہے ۔ "

ابھی اس کے الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ مینڈکوں کا اہرام لرزا اور ایک دوسرے

کے کاندھوں پر چڑھے ہوئے مینڈک دھپ دھپ نیچے لڑھک گئے۔ دو چار کمزور مینڈکوں کی تو آنتیں نکل آئیں۔ بعض وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اردگرد کے ٹاپوؤں کے مینڈک بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ ہنسی، قہقہے، فقرے بازی اور شور و غوغا سے تھوڑی دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔

آخر مگرمچھ کو مداخلت کرنی پڑی۔

"خاموش، خاموش اے ندی کے باسیو! خاموش، یہ جائے مسرت نہیں مقامِ عبرت ہے کہ تمہاری چھوٹی چھوٹی نفرتوں نے تمہارے قد گھٹا دیے ہیں۔ اور تم ـــــ تم سب اپنی ہی لاشوں پر قہقہے لگانے کے لیے زندہ ہو۔"

"اے صاحبِ عقل و دانش! کیا ہمیں اپنے دشمن کی مات پر خوش ہونے کا حق نہیں۔ یہ فتنہ حرام عرصۂ دراز سے دوسروں کے کاندھوں پر چڑھ کر ہمیں دھمکاتا رہتا تھا۔"

"دشمن!" مگرمچھ نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"تم نہیں جانتے کہ بعض اوقات دشمنی بھی تمہارے ظرف کا پیمانہ بن جاتی ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، مرنے والے کی صورت میں تمہیں اپنی صورت دکھائی دے گی۔ کان کھول کر سنو۔ اس کی آواز میں تمہیں اپنی آواز سنائی دے گی۔ دشمن کی شناخت مشکل ہے اس لیے کہ دوست کی شناخت مشکل ہے۔"

"اے مدبرِ وقت! تو ہی ہمیں کوئی تدبیر بتا کہ ہمارے دل نفرتوں کے غبار سے دھل جائیں اور ہمارے سینے محبتوں کے نور سے معمور ہو جائیں۔ تجھے ہم عقل و فہم کا پتلا اور تجربات کا مرقع جانتے ہیں۔"

"اگر ماحول سازگار نہ ہو تو تدبر تضحیک کا نشانہ اور تجربہ تہمت کا بہانہ بن جاتا ہے یاد رکھو گھوروں پر کبھی گلاب نہیں کھلتے۔ تم نے نفرت بوئی تھی نفرت ہی کاٹو گے....."

"مگر تیرے سوا کون ہماری رہ نمائی کر سکتا ہے کہ ہم بالاتفاق رائے تجھے اپنا مربی سمجھتے ہیں۔"

ایک چیکبرا مینڈک پھدک کر مگرمچھ کے قریب ہوتا ہوا مکھن چپڑے لہجے میں بولا۔ اور پھر اس انداز سے چاروں طرف دیدے گھمائے جیسے اپنے ہم جلیسوں سے کہہ رہا ہو۔ میرا کاٹا کبھی بھولے سے نہ پانی مانگے۔

بوڑھا مگرمچھ اس چالاک مینڈک کی نیت بھانپ گیا۔ ایک نگاہِ غلط انداز اُس پر ڈالی اور پھر دوسرے مینڈکوں سے مخاطب ہوا۔

"مُربّی ایک ایسے بدطینت شخص کو کہتے ہیں جو زیر دستوں کی دست گیری محض اس لیے کرتا ہے کہ وہ تاحیات اُس کی غلامی کا دم بھرتے رہیں۔"

مگرمچھ کے اس کرارے جواب نے مختلف ٹاپوؤں میں ایک غُلغلہ ڈال دیا۔ دیر تک مینڈک ٹرّاتے اور قہقہے لگاتے رہے اور وہ چت کبرا مینڈک غصّے اور ندامت سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ جب شور ذرا کم ہوا تو چت کبرا مینڈک ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا چیخا۔

"انا ــــ اے ناصحِ نامہرباں، تیری تلخ نوائی نے میری انا کو لہولہان کر دیا ہے۔ اپنی انا کی حفاظت میری زندگی کا مقصدِ اعلیٰ ہے۔ میں تلوار کا گھاؤ سہہ سکتا ہوں۔ اپنی انا پر ضرب نہیں سہہ سکتا۔"

"انا" ــــ مگرمچھ نے اس چھوٹے سے مینڈک کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"چیونٹی اپنے منہ میں شکر کا دانہ لیے چلتی ہے تو اپنی دانست میں سات پہاڑوں کا بوجھ اس پر لدا ہوتا ہے۔ تم پنی ڈیڑھ انچ کی انانیت کو آخر اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہو جو پانی کے ایک ریلے سے بہہ جاتی ہے، ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے اُڑ جاتی ہے۔ جب تک تمھاری انانیت تمھارے وجود کا حصّہ نہیں بنتی، وہ چھپکلی کی کٹی دُم کی مانند بے حقیقت اور حقیر ہے۔ تمھاری مشکل یہ ہے کہ تم سب چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹے ہو اور ہر کوئی اپنے جزیرے کو کرّۂ ارض کے برابر سمجھتا ہے۔"

مگرمچھ کا یہ وار بہت صاف اور تیکھا تھا۔ شدید تکلیف سے ان کے لہو میں گرہیں پڑ گئیں۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غصّہ، ذلت اور ندامت نے ان کی عجیب کیفیت کر دی تھی۔ انھیں لگ رہا تھا کوئی انھیں رسّی کی طرح بٹتا جا رہا ہے۔ مگر وہ کیا کر سکتے تھے کہ ان کے پاس نہ سانپ کا سا پھن تھا، نہ بچھّو کا سا ڈنک۔ البتہ وہ چیخ سکتے تھے کہ اب ان کی چیخ ہی اُن کے وجود کی گواہی بن سکتی تھی۔ لہٰذا ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بیک زبان ٹرّانے لگے۔ اپنی ہستی کی نہتائی بنیادوں سے ٹرّانے لگے۔ مگرمچھ ضبط و تحمّل سے ان کی ٹرّاہٹ سنتا رہا۔ اور خاموشی سے ان کے گلوں کی پھولتی پچکتی جھلیوں کو دیکھتا رہا۔ جب ٹرّاتے ٹرّاتے ان کی گردنوں کی جھلیاں لٹک گئیں، پیٹ پچک گئے۔ تب مگرمچھ نے آہستہ سے گردن اُٹھائی۔ یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے مینڈکوں پر ایک متاسفانہ نگاہ

ڈال، چھوٹے بڑے، نیلے پیلے کالے، سفید، دُبلے پتلے، موٹے تگڑے۔ سارے کے سارے مینڈک منہ کھولے، گردنیں ڈالے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ اب اُن کی آخری چیخ بھی اُن کے سینے کی لحد میں سو چکی تھی۔ آخر ایک طویل وقفے کے بعد مگرمچھ گویا ہوا۔

"اے ندی کے باسیو۔ تم میں سے ہر کوئی خود غرضی کے محور پر چاک کی طرح گھوم رہا ہے۔ تمھاری نظروں میں سارے رنگ یوں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ اب رنگوں کی تمیز ممکن نہیں۔ لہٰذا اب میرے پاس تم سب کے لیے ایک سفاک دعا کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں دعا مانگتا ہوں۔ دُعا کے اختتام پر باآوازِ بلند "آمین" کہنا۔ یہی تمھاری نجات کا آخری حیلہ ہے۔"

مینڈکوں نے مگرمچھ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اپنے کرچی کرچی وجود کے ساتھ ٹکر ٹکر اسے گھورتے رہے۔ اب اُجالے کے پر سمٹنے لگے تھے۔ سورج ایک کیکر کے دو شاخے میں پھنسا پھڑپھڑا رہا تھا۔ اُس کے خون کی لالی قطرہ قطرہ ندی کے چہ بچوں میں سونا گھول رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی دل کو مسوس دینے والی اُداسی بکھر گئی تھی۔ تبھی مگرمچھ نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھایا۔ آنکھیں بند کریں اور دُعا مانگنے لگا۔

"اے بحر و بر کے مالک۔ اے خشکی کو تری اور تری کو خشکی میں بدلنے والے ـــــ زمانہ بیت گیا یہ ندی سوکھتی جا رہی ہے اور ہم کہ جنہیں ایک ہی ندی کے باسی کہلانا تھا، الگ الگ ٹاپوؤں میں بٹ گئے ہیں۔ اے قطرے سے دریا بنانے والے اور ندیوں کو سمندر سے ملانے والے ہمارے رب! ہماری اس سوکھتی ندی میں کسی صورت باڑھ کا سامان پیدا کر، تاکہ ہم جو ان چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں میں تقسیم ہو گئے ہیں پھر سے ندی میں گھل مل جائیں۔ اور اس کے وسیع دامن میں جذب ہو کر اسی کا ایک حصہ بن جائیں۔

سیلاب! صرف ایک تند و تیز سیلاب!!"

مگرمچھ دُعا ختم کر کے تھوڑی دیر تک آنکھیں موندے مینڈکوں کے 'آمین' کہنے کا منتظر رہا۔ مگر جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی کہیں سے 'آمین' کی صدا بلند نہیں ہوئی تب اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اردگرد کے ٹاپو خالی پڑے تھے۔ تمام مینڈک ندی کے کم کم گدلے اور بدبودار پانی میں ڈبکیاں لگا چکے تھے۔ ●●

دو چراغ

اپنے ہی حلق سے نکلی ہوئی کراہ اسے کسی دور کی وادی سے آتی ہوئی صدائے بازگشت لگی۔
نبض یوں ڈوب رہی تھی جیسے کوئی جہاز دھیرے دھیرے تہہ آب ہوتا جا رہا ہو۔ اس کا جسم ساکت تھا اور آنکھوں کے سوا کسی عضو میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ سب کچھ بے حس و حرکت ہو چکا تھا، حتیٰ کہ اب درد کا احساس بھی ختم ہوتا جا رہا تھا البتہ ذہن حیرت انگیز طور پر بیدار ہو گیا تھا۔

وہ گردن کو گھما نہیں سکتا تھا۔ صرف دیدوں کو حرکت دے کر ارد گرد نگاہ ڈال لیتا۔ غالباً وہ بیچ سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ بائیں طرف اپنا بازار کی دکانوں کی قطار تھی۔ ساری دکانوں کے شٹرز گرے ہوئے تھے۔ اس نے دو چار دکانوں کے سائن بورڈ پڑھنے کی کوشش کی۔

"شکتی میڈیکل اسٹور"

"بھارت جنرل اسٹور"

"بدرالدین سویٹ میٹ مارٹ"

"بھوسلے مسالے والا"

"نیو گلشن ریسٹورنٹ"

اس سے آگے اس سے پڑھا نہیں گیا۔ حروف دھندلانے لگے تھے۔

درد کی ایک ہلکی سی لہر نیچے کہیں، اس کی ریڑھ کی ہڈی سے اٹھتی ہوئی گردن کی طرف چلی۔ اس نے کراہنا چاہا مگر آواز حلق ہی میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اس نے دیدے گھمائے۔ دائیں طرف کرشنا تالاب تھا۔ کرشنا تالاب کے کنارے بنی ریلنگ سنسان تھی البتہ تالاب کے بیچ میں دو کشتیاں ہولے ہولے ڈول رہی تھیں۔ کشتیاں خالی تھیں۔ تالاب کے پس منظر میں عمارتیں تھیں۔ انھیں میں ایک عمارت

بری طرح جلسی ہوئی تھی جس سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ عمارتوں کے درمیان مسجد کا گنبد صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گنبد کے اوپر ہلال کا نشان تھا۔ بالکل سامنے ہنومان ٹیکری تھی۔ جس کی چوٹی پر بنا ہنومان مندر اور اس کے کلس پر لہراتا چھوٹا سا بھگوا جھنڈا۔

اور ان سب کے اوپر آسمان میں چمکتا سورج، جس کی تیز شعاعیں اس کی آنکھوں میں گڑ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ ایک سرخ گیلے گیلے اندھیرے کی چادر اس کی بصارت کے آگے تن گئی۔ چادر سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ اسے کیا ہو گیا ہے، وہ اٹھنا چاہتا ہے۔ اٹھ کر چلنا چاہتا ہے، دوڑنا چاہتا ہے، چیخنا چلّانا چاہتا ہے۔ مگر وہ تو جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے پورے جسم کو کیلوں سے ٹھونک دیا ہے۔ کس نے اس کی ایسی حالت کی؟ کون تھے وہ لوگ؟ وہ کسی کو بھی تو نہیں دیکھ سکا۔

وہ سب اندھیرے سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہو گئے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ معاملے کو سمجھ سکتا۔ انھوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ کسی نے اپنے ہاتھ کی چمکتی کرپچی اس کے سینے میں گھسیٹر دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر ایک سنسناتا ہوا تلوار کا وار اس کے دائیں کاندھے پر پڑا تھا اور وہ زمین پر لڑھک گیا۔ وہ چیخ بھی نہیں سکا نہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکا۔ اس کے منھ سے ایک دردناک کراہ نکل گئی تھی بس۔ پھر اس کے چاروں طرف اندھیرے کی تہیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ گہری، بے حد گہری۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج اس کی پلکوں پر اتر آیا تھا۔ اوپر آسمان میں سفید بگلوں کی ایک ڈار اڑی چلی جا رہی تھی۔ بگلے بہت اوپر تھے۔ اس کی حد سماعت سے پرے۔ مگر اسے ان کے پروں کی نرم پھڑپھڑاہٹ اپنے لہو میں گھلتی محسوس ہوئی۔ اُف! پھر وہی درد کی لہر ـــــ نس نس میں اٹھتی ٹیس ـــــ جیسے ـــــ جیسے کسی خاردار جھاڑی پر ریشمی چادر کو بچھا کر دھیرے دھیرے کھینچا جا رہا ہو۔ کتنا کرب؟ کتنا سکون؟ یہ لمحہ لمحہ بدلتی کیفیت کیسی ہے؟

اس نے پھر گردن گھمانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ کوشش کے نتیجے میں درد کی ایک نئی لہر گردن کے نیچے سے اٹھ کر پوری ریڑھ کی ہڈی میں پھیل گئی۔ اس نے کراہنے کے لیے منھ کھولا، مگر اس کی کراہ حلق میں گھر گھرا کر رہ گئی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور ذہن کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اتنے میں کہیں سے ایک منظر سرکتا ہوا سا آیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کچھ شبیہیں ابھرنے لگیں۔ کچھ بچے

دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ قلقاریاں مارتے، ہنسی کے پھول بکھیرتے، ننھے ننھے ہاتھ پیر، شگفتہ چہرے، مسکراتی آنکھیں۔ ان کے آگے آگے رنگ برنگی پروں والی تتلیاں اڑ رہی تھیں اور وہ سارے کے سارے بچے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے انھیں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں بچوں میں اس کا اپنا بچہ بھی تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اچانک ان تتلیوں کا حجم بڑھنا شروع ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساری تتلیاں چیلوں جتنی بڑی ہوگئیں اور اس سے پہلے کہ بچے کچھ سمجھتے وہ پلٹ کر ان پر جھپٹ پڑیں۔ ان کے پروں کی خوفناک پھڑپھڑاہٹ سے فضا بھر گئی۔ ان کی تیز مڑی ہوئی منقاریں بچوں کی گردنوں میں پیوست ہوگئیں۔ ایک چیل اس کے بچے پر بھی جھپٹی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس کا ننھا سا منھ کھل گیا۔ وہ چیخا مگر اس کے حلق سے آواز بالکل نہیں نکلی۔ اسے پورا منظر یوں لگا جیسے کوئی گونگی فلم دیکھ رہا ہو۔

اس نے پھر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ مگر وہاں نہ تتلیاں تھیں نہ بچے ــــ الکٹرک پول پر ایک کوّا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ اس کی منقار بار بار یوں کھل بند ہو رہی تھی، جیسے کوئی ہوا میں مقراض چلا رہا ہو۔ وہ کوّے کو غور سے دیکھتا رہا۔ کوّا بھی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر کائیں کائیں کیے جا رہا تھا۔ پھر کوّے کی چونچ لمبی ہونے لگی۔ لمبی اور لمبی ــــ اب مقراض کی دونوں نوکیں اس کی آنکھوں میں کھُب رہی تھیں ــــ

منظر پھر بدلا ــــ

ایک عورت ــــ جوان عورت، نیم عریاں حالت میں ایک اونچی عمارت کی کگار پر کھڑی تھی، اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے یا پھاڑ دیے گئے تھے۔ اس کے ہاتھوں، پنڈلیوں اور چہرے پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں جن سے تازہ تازہ خون رس رہا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا، وہ عورت کوئی اور نہیں اس کی بیوی تھی۔ اتنے میں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ دہشت زدہ سی ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے لگا، اس کی ایک ذرا سی غفلت اسے بیسوں فٹ نیچے گرا سکتی ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پیچھے ہٹنے کو کہا۔ مگر وہ اس کی طرف قطعی متوجہ نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے پوری قوت سے چیخی۔ اور دوسرے ہی لمحے پوری عمارت تاش کے گھروندے کی طرح لرزی اور بھربھراتی ہوئی اس پر گرنے لگی۔

اس نے پھر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

الکٹرک پول پر پہلے کوّے کے پہلو میں دوسرا کوّا آکر بیٹھ گیا تھا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ کیسے منظر ہیں؟ اس نے ذہن پر زور دینے کی بیحد کوشش کی مگر وہ ان مناظر کو کوئی معنی نہ دے سکا۔ بس ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے وہ کسی تند و تیز دھارے میں غوطے کھا رہا ہے۔ لمحے بھر کو اس کا سر سطح سے اوپر اٹھتا ہے۔ ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے اور وہ پھر سطح آب کے نیچے چلا جاتا ہے۔ ابھرنے پر اس کا اختیار ہے نہ ڈوب جانے پر اس کا بس — ڈوبنے ابھرنے کی اس کیفیت نے اسے بے حد نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اب آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہتا تھا۔

ایک بے حد گہری نیند سو جانا چاہتا تھا۔

مگر ضروری تو نہیں کہ آدمی جب آنکھیں بند کرے اسے نیند آ ہی جائے۔

آنکھیں بند کرتے ہی اسے ایک جلتا ہوا مکان دکھائی دیا۔ مکان کے چاروں طرف سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ دھوئیں کے مرغولے اٹھ اٹھ کر آسمان میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ شعلوں کے پس منظر میں اس نے دیکھا کہ ایک بڑھیا اس جلتے مکان سے باہر نکلنا چاہتی ہے مگر لپلپاتے شعلے اس کا راستہ روک رہے ہیں۔ بڑھیا مدد کے لیے چلاتی ہے۔ وہ اس کی آواز پہچان لیتا ہے وہ اس کی ماں ہے۔ وہ اسے بچانے کے لیے بھاگتا ہے اور جلتے مکان میں دیوانہ وار گھس جاتا ہے۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ اس کی ماں تو عمارت سے باہر کھڑی ہے اور ہاتھ ہلا ہلا کر اسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو جلتی عمارت میں داخل ہو چکا تھا اور لپلپاتے شعلے اب عمارت کی چھت کو چاٹنے لگے تھے۔ وہ عمارت سے باہر نکلنا چاہتا ہے مگر وقت گزر چکا ہے۔ ایک شہتیر جلتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے اور ایک بار پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اب الیکٹرک پول پر بے شمار کوّے جمع ہو چکے تھے۔ دائیں، بائیں — اوپر نیچے — اس کی نظر دھندلانے لگی۔ کیا واقعی اس قدر کوّے جمع ہو گئے ہیں یا یہ محض اس کی بینائی کا دھوکہ ہے — کوّے بک رہے ہوں اور اس کی آنکھوں کے سامنے کھنچی ہوئی گیلی گیلی دھندلی دھندلی بینائی کے کارن اسے وہ کچھ نہ دکھائی دے رہے ہوں۔

"بیٹا — آج کام پر مت جا — شہر میں بڑا ہنگامہ ہے۔"

"پورا شہر فساد کی لپیٹ میں۔"

"سنئے، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے — آپ آج کام پر نہ جائیے۔"

"دس ہلاک — پچاس زخمی۔"

"بتیا میلے کو ٹکٹ دانا ــــ بہت چھالے ٹکٹ۔"

"لاٹھی چارج ــــ فائرنگ ــــ کرفیو"

"یار تمہارے علاقے میں تو کرفیو لگا تھا۔ تم کیسے آگئے کام پر"؟

"کرفیو رات کا ہے۔ ویسے بھی آخر کب تک بیٹھیں یار گھر میں۔ پیٹ کی آگ فساد کی آگ سے زیادہ جھلسا دینے والی ہوتی ہے۔"

کرفیو لگنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چلا جارہا ہے۔ سڑک سنسان ہے۔ ارد گرد کی عمارتوں میں سناٹا۔ پاس ہی ایک ملک بوتھ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ سڑک کے ایک کنارے کانچ کی کرچیں بکھری ہوئی ہیں۔ اکثر الیکٹرک پولوں کے بلب اندھے کر دیئے گئے ہیں اور وہ قدم اٹھاتا جلدی جلدی گھر کی طرف جارہا ہے۔

ہزاروں بار وہ اس سڑک سے گزرا ہے۔ تقریباً روز ہی گزرتا ہے۔ یہ سڑک اور اس کے آس پاس کی ایک ایک چیز اس کی دیکھی بھالی ہے مگر بعض اوقات دیکھی بھالی چیزیں بھی کتنی اجنبی ہو جاتی ہیں۔ اچانک اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس وقت اس کی قوت سماعت ہزار گنا بڑھ گئی تھی بلکہ اس کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک پتلی سی گلی میں آہٹ سی ہوئی۔ پھر سرگوشیاں ــــ پراسرار سرگوشیاں ــــ دہشت انگیز سرگوشیاں ــــ گلی سے چند سایے نکلے اور وہ ٹھٹکا ــــ ٹھٹک کر رکا ــــ سایے اس کی طرف بڑھے ــــ پلک جھپکتے وہ سایوں میں گھر کر رہ گیا۔ وہ منتظر تھا کہ شاید کوئی اس سے پوچھے۔ وہ کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ اس کا دھرم کیا ہے؟ وہ کسی مذہب یا مسلک کو مانتا بھی ہے یا نہیں؟ مگر کسی نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ جیسے وہ سب جانتے ہوں کہ وہ کون ہے؟ جیسے ان سب کو معلوم ہو کہ انھیں کیا کرنا ہے؟

ایک سایے میں حرکت ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی لہرائی اور سیدھے اس کے سینے میں دھنستی چلی گئی۔ اس نے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ پھر دوسری بجلی اس کے دائیں کندھے پر گری۔ دور کہیں پولیس کی سیٹی بجی۔ سایے تیزی سے دوبارہ اندھیرے میں مدغم ہو گئے۔ پولیس کی سیٹی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ اور یک بیک اس کے پیروں تلے زمین یوں کانپی جیسے کوئی بہت بڑا سیارہ اچانک اس کرے کے قریب سے گزر گیا ہو۔ پھر اس کی پلکوں پر اندھیرا تہہ بہ تہہ جمتا چلا گیا۔

کون تھے وہ لوگ ؟ دوست ؟ دشمن ؟! ـــ نہ دوست نہ دشمن ـــ پھر ان لوگوں نے کیوں مارا ؟ اسے مار کر انھیں کیا ملا ہوگا ؟ اس کے پاس کیا تھا ؟ اس کے پاس کیا تھا ؟ خالی جیبیں ـــ خالی ٹفن بکس ـــ نہیں ٹفن بکس خالی نہیں تھا۔ اس میں ایک کیلا اور دو بسکٹ تھے جو بچے پر سے سمیٹیں سے ملے تھے اور اس نے انھیں اپنے بچے کے لیے...... کوئی گرم سیال تیزی سے اس کے سینے سے اچھل کر حلق میں آکر اٹک گیا۔ یہ سب کیا ہے ؟ یہ سب کیسے ہوا ؟ کیوں ہوا ؟ اس کے پاس ایک سوال کا بھی جواب نہیں ہے۔ وہ دماغ پر زور دیتا ہے کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے سے ان سوالوں کے جواب خود در ہوں۔ مگر اس کے ذہن میں تو سناٹا ہے۔ سوالات آوارہ بگولوں کی مانند اٹھتے ہیں اور دھول اڑاتے گزر جاتے ہیں اور جوابات چمکتے ستاروں کی مانند کبھی نظر آتے ہیں کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں۔ نہ سوالات پر اس کا اختیار ہے نہ جوابات اس کے قابو میں ہیں۔ کوّوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

کائیں کائیں ، کائیں کائیں

مندر کا بھگوا جھنڈا برابر لہرا رہا ہے۔

مسجد کا ہلال چمک رہا ہے۔

جھلسی ہوئی عمارت سے دھواں نکل رہا ہے۔

اب سورج زمین پر اس کی پیشانی پر مرتسم رہتا ہے۔ وہ سورج کو اپنی پیشانی سے جھٹک دینا چاہتا ہے۔ مگر ـــ وہ تو جنبش کرنے سے بھی قاصر ہے۔

کوّوں کی کائیں کائیں چاروں طرف گونج رہی ہے۔ مندر کا بھگوا اور مسجد کا ہلال اونچے بہت اونچے ہو کر آسمان کو چھو رہے ہیں۔ جھلسی عمارت کا دھواں پھیل پھیل کر ہر شے کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ افق کے فاصلے گھٹ رہے ہیں۔ زمین سکڑ کر ایک تابوت کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور آسمان ـــ ـــ آسمان ایک نیلی چادر کی طرح اس پر تنا ہوا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اس تنگ زمین کے دائرہ اور اس مخدوش آسمان کے نیچے کبھی بھی اطمینان کی سانسیں نہیں لے سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔

اسے مکاں اور لامکاں کی حدوں سے نکلنا ہوگا۔ مگر کیسے نکلے ؟ کدھر سے نکلے ؟ اس کی راہ میں تو بے شمار رکاوٹیں کھڑی ہیں۔

کوّوں کی کائیں کائیں۔ مندر کا بھگوا ، مسجد کا ہلال ، جھلسی عمارت کا دھواں ، آداب کی جھکی جھکی

لہریں، لہروں پہ ہلکورے لیتی کشتیاں، نیلے آسمان کی چھت سے لٹکتا روشن سورج ـــــ وہ ان سب سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان سب کو اپنے وجود سے جھٹک دینا چاہتا ہے۔

آخر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر شے سے اپنی ہستی کو علیحدہ کرے گا تبھی وہ سکون سے سو سکے گا۔ اس نے اپنی ساری قوت سمیٹ کر آنکھوں میں جمع کر لی۔

اب اس کا جسم سرد ہو چکا تھا مگر آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے سب سے پہلے کائیں کائیں کرتے کوؤں کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بندوقوں کی نالیں بن گئیں۔ دھائیں دھائیں، دھائیں دھائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کوّے اس کی نظروں کے سامنے پھڑپھڑا کر ڈھیر ہو گئے۔ پھر اس نے مندر کے کلس کی طرف دیکھا، مندر کا کلس شعلہ بن گیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا ـــــ اب وہاں مندر کی جگہ چٹیل میدان تھا۔ پھر اس نے مسجد کے ہلال پر نگاہ ڈالی۔ ہلال کپکپایا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہلال، مسجد کا گنبد بلکہ پوری مسجد دھواں ہو کر نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس تباہی سے اسے اندر ہی اندر بڑی راحت کا احساس ہوا۔ اب اس نے ہر اس شے کو نیست و نابود کرنا شروع کر دیا جو اس کی نظروں کی زد میں تھی۔ مندر، مسجد، اونچی اونچی عمارتیں، تالاب، تالاب میں تیرتی کشتیاں ـــــ جب وہ اپنے اردگرد کی ایک ایک چیز کو تباہ کر چکا تب اس نے آخری دہکتی ہوئی نگاہ اپنے سر پر لٹکتے سورج پر ڈالی۔ بھک سے سورج گل ہو گیا جیسے کسی نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا ہو۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔

تبھی اسے لگا اس کا وجود ہوا کی طرح لطیف ہو کر اس مخملی اندھیرے میں لپٹا اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ ●●

ایک لویہ

ہرنیہ دھنش بھیل اپنے اکلوتے لڑکے ایک لویہ کو ساتھ لیے جنگل بیابان، ندی نالے، پہاڑ، وادیاں طے کرتا، ہفتوں مہینوں کی صعوبتیں جھیلتا اندرپرستھ پہنچ گیا۔

جب وہ شہر میں داخل ہوا تو کافی دن چڑھ آیا تھا اور سایے سمٹ رہے تھے۔ صاف ستھری سڑکوں پر خاصی چہل پہل تھی، بازار سج گئے تھے اور لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے، پروہت اپنے چوڑے ماتھوں پر تلک لگائے، لمبی لمبی چوٹیاں ڈالے جنیو پہنے، کھڑاؤں کھٹکھٹاتے مندروں سے نکل رہے تھے، لوگ انھیں دیکھتے اور پرنام کے لیے ہاتھ جوڑ دیتے اور وہ ہاتھ اٹھا کر ان کا پرنام سویکار کرتے۔ کبھی کبھی کوئی سپاہی کمر میں تلوار لٹکائے، طرے دار مکٹ پہنے گھوڑے پر بیٹھا ٹپ ٹپ کرتا گزر جاتا۔ کچھ بدھ بھکشو گیروے رنگ کی دھوتی باندھے، ننگے شریر، منڈے سر، گدّی پر چھوٹی سی چٹیا رکھے، ماتھے پر بھبھوت ملے، ہاتھوں میں بھکشا پاتر لیے بھکشا مانگتے دکھائی دے رہے تھے۔

اتنے میں ہرنیہ بھیل اپنے لڑکے ایک لویہ کی انگلی پکڑے سڑک پر نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی پروہتوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ خرید و فروخت میں مصروف لوگ مڑ مڑ کر بھیل اور اس کے لڑکے کو دیکھنے لگے۔ ایک گھڑسوار سپاہی کی بھی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہرنیہ کے قریب پہنچ کر چابک لہرایا اور گرج دار آواز میں پوچھا۔

"اے چانڈال! سویرے سویرے شہر میں کیا لینے آیا ہے؟ اور پھر آج تو برہسپتی وار بھی نہیں۔"

"میں کوئی وستو خریدنے تتھا بیچنے نہیں — بلکہ دیوروپ گرودیو راج درونا چاریہ سے ملنے آیا ہوں۔"

تب تک وہاں کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ سب نے بیک زبان دوہرایا۔

"گرو راج درونا چاریہ سے ملنے ؟"

جیسے اُنھیں اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

"جی — جی — ہاں —"

ہرنیہ کا حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔ لوگوں کی برچھیوں جیسی تیز نظروں کی تاب دنا اُس کے لئے ناممکن ہو رہا تھا۔

"سپاہی گرجا"

"تم ایک ذلیل شُودر ہو کر گرو راج سے ملنے کی بات کرتے ہو؟ جانتے ہو یہ اپرادھ ہے"۔

ہرنیہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

"کشتری پتر! میں جانتا ہوں یہ اپرادھ ہے۔ پرنتو سنتان کی ہٹ نے مجھے یہ اپرادھ کرنے پر دوش کیا ہے۔"

"کس کی سنتان نے —؟"

"میری اپنی سنتان نے راج رکشک!"

ہرنیہ نے اپنی اُنگلی پکڑے ایک بویہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہٹ ہے اِس کی؟"

سپاہی نے کالے دُبلے ایک لڑکے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کمان تھی، اور کاندھے سے لٹکا ترکش تیروں سے بھرا تھا۔

"یہ سرد مہان پرم گرو درونا چاریہ سے دھنر ودیا لینا چاہتا ہے کشتری پُتر!"

ہرنیہ کی یہ بات سنتے ہی جیسے تو سپاہی نے ادھر اُدھر لوگوں کی طرف دیکھا۔ لوگ ایک ہنسی کے اس دُسا ہس پر حیران کھڑے تھے۔ سپاہی نے کھنکار کر کہا۔

"بے پ نڈال پُتر اگر دوریہ درونا چاریہ تو دیا کیول برہمن اور کشتری پتر کو سکھاتے ہیں۔ تو برہمن ہے نہ کشتری پھر تو دھنر ودیا کیسے پراپت کرے گا؟"

اب کی ایک بویہ نے گردن اُٹھا کر جواب دیا۔

"میں اپنی شمتا سے گرو راج کو رضی کروں گا۔"

"ذرا ہمیں بھی ثبوت دو اپنی شمتا ؟"

اُس نے ارد گرد کھڑے لوگوں کی طرف دیکھ کر طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا۔ لوگ بھی مضحکہ اُڑانے والے انداز میں گردنیں ہلا کر سپاہی کی تائید کرنے لگے۔

یک لویہ نے جھٹ سے کمان سیدھی کی ترکش سے تیر کھینچا اور بے حد مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر تاکا۔ آسمان پر ایک مرغابی اُڑتی جا رہی تھی۔ بھیل بچے نے بجلی کی سرعت کے ساتھ تیر کمان پر چڑھا دیا۔ بایاں پاؤں آگے رکھا۔ دائیں پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیکا اور نشانہ باندھ کر جھٹ چھوڑ دیا۔ تیر سنسناتا ہوا نکلا۔ اور چشم زدن میں مرغابی تیر میں بندھی پھڑپھڑاتی یک لویہ کے قدموں میں آ گری۔ سپاہی سمیت وہاں موجود سبھی لوگ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی مرغابی کو دیکھتے، کبھی یک لویہ کو ــــ بعض لوگوں کی زبان سے تو بے ساختہ واہ واہ نکل گئی۔ چند لمحے تڑپ کر مرغابی ٹھنڈی ہو گئی۔ لوگوں میں تحسین اور تجسس کی ملی جلی سرگوشیاں ہونے لگیں۔

"واہ، کیا نشانہ ہے۔"

"کون ہے یہ بھیل پُتر ــــ ؟"

"کہاں سے آ رہے ہیں یہ لوگ ــ ؟"

"کس سے ملنے آئے ہیں ؟"

"راج گرو درونا چاریہ سے۔"

"راج گرو سے ؟"

"ہاں سُنا ہے یہ بھیل پُتر راج گرو سے دھنر ودیا سیکھنا چاہتا ہے۔"

"بھیل پُتر ہو کر راج گرو سے دھنر ودیا ــــ ؟ یہ تو دُساہس ہے۔"

"راج گرو کبھی اسے دھنر ودیا نہیں دیں گے۔"

"کہاں یہ بھیل پتر اور کہاں راج گرو درونا چاریہ۔"

"دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

گھڑ سوار تھوڑی دیر تک بُت بنا یک لویہ کو دیکھتا رہا۔ پھر کھنکار کر بولا۔

"ہُم ـــــ جا ـــــ مہا بے نو جاکر راج گرو سے مِل لے۔ مگر کہے دیتا ہوں۔ وہ تجھے وِدّیا بدّیا کچھ نہیں سکھائیں گے۔ جو وِدّیا ارجن اور بھیم جیسے راجکمار سیکھ رہے ہوں تجھے کون سکھائے گا۔"

"مگر ایک بار گرو راج کے درشن ہو جاتے تو سپھر آنا سپھل ہو جاتا۔"

ہر نیہ دھنش نے عاجزی سے کہا۔

"اِس سمے گرو راج راج محل کے رنانگن میں راجکماروں کو پریکٹش دے رہے ہوں گے کسی طرح وہاں پہنچ جاؤ گرو راج کے درشن ہو جائیں گے۔"

اتنا کہکر گھڑ سوار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا جھٹکا کھا کر آگے بڑھا۔ بھیڑ نے گھوڑے کو راستہ دے دیا۔ سوار دلکی چال چلتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔

ہر نیہ ایک لوہے کی ننگی پکڑے راج محل کی طرف چل پڑا۔

جب وہ لوگ رنانگن کے بڑے دوار پر پہنچے تو وہاں دوار پال نے انھیں ٹوکا۔

"ارے چانڈال! کہاں گھُسے چلے آرہے ہو؟ جانتے نہیں یہاں دُشٹ آتماؤں کو آنا منع ہے۔"

"سرکار! دیا کیجئے، ایک بار راج گرو درونا چاریہ جی کے درشن کرا دیجئے۔ ایسور کے لئے تنا اپکار کیجئے بس۔"

"چپ کر دُشٹ۔ ایک پشاچ ہو کر مہا گرو درونا چاریہ کے درشن کرنا چاہتا ہے۔ جانتا ہے تو نے اپنی اپوتر زبان سے مہا گرو کا نام لے کر ایک گھور پاپ کیا ہے۔ اس پاپ کے بدلے تیرے منہ میں دس ننگی لوہے کی سلاخ گرم کر کے گھُسیڑی جا سکتی ہے۔"

"دیا کیجئے پتر دیا۔" ہر نیہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھا زمین سے لگا دیا۔

ہر نیہ کو یوں بے طرح گڑ گڑاتے دیکھ کر دوار پال کا غصّہ کم ہوا۔ اُس نے اپنی بھویں تان کر پوچھا۔

"تو آچاریہ دیو سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

"اس ہٹّی بالک کے لیے سرکار، یہ آچاریہ دیو سے دھنر وِدّیا سیکھنا چاہتا ہے۔"

دوار پال نے کس پر زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر دیر تک ہنستا رہا۔

تم کچھ پاگل بھی معلوم ہوتے ہو۔ ارے آچاریہ دیو ایک بھیل پتر کو دھنر وِدّیا سکھائیں گے۔

"ہا ۔۔ ہا ۔۔ ہا ۔۔"

وہ دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"سرکار! میں جانتا ہوں یہ دُسّاہس ہے مگر بن ہٹ کے کارن وِدوش ہو گیا ورنہ بار بار چندا یا۔ ایک بار آچاریہ دیو کے درشن ہو جاتے تو اُن کے چرنوں میں گر کر نویدن کرتا۔ پھر وہ جیسی آگیا دیں گے ویسا ہی کروں گا۔"

"ارے چنڈال پُتر!" اچانک دوارپال ایک لویہ سے مخاطب ہوا۔

"کیا تو تیر چلانا جانتا ہے؟"

"سرکار بس چِتّہ کھینچ لیتا ہے۔" ہرنیہ دھنو نے جلدی سے کہا۔

"سامنے پیڑ پر لگے جس پھل کی اور آپ سنکیت کریں آپ کے چرنوں میں گرا دوں گا۔"

ایک لویہ نے سامنے آم کے پیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہرنیہ جلدی سے بولا۔

"سرکار! بچہ ہے ایسے ہی بکتا ہے۔"

مگر دوارپال نے ہرنیہ کی بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اور ایک لویہ کو گھور کر دیکھتا ہوا بولا۔

"دیکھ اگر تو اُن تین آموں کے گچھے کو پہلے ہی تیر میں نہ گرا پایا تو تیرا دھنش بان چھین کر تیرے اور تیرے باپ کے سر پر دس دس جوتے لگائے جائیں گے۔"

"منظور ہے۔"

ایک لویہ نے کمان سیدھی کی۔ ترکش سے تیر نکال کر بایاں پیر آگے بڑھا کے پیڑ کی اور منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہرنیہ دھنش گھبرا گیا۔

"سرکار، جانے دیجئے۔ شما کر دیجئے۔ یہ ابھی نادان ہے۔"

پھر ایک لویہ کا دھنش پکڑ کر بولا۔

"ایک لویہ! تجھے شرم نہیں آتی سرکار سے زبان لڑاتا ہے۔"

"نہیں اُسے روکو مت، اُسے تیر چلانے دو۔ اگر نشانہ چوک گیا تو دس جوتے کھانے کو تیار ہو جاؤ۔"

"سرکار! آپ مالک ہیں، ابھی دس جوتے لگا دیجئے۔ اس میں شرط کی کیا بات ہے۔"

"نہیں ــــ یہ تیر چلائے گا۔ ہاں ــــ چلاؤ تیر ــــ"

دواریپال نے ایک لویہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک لویہ نے تیر چلّے پر چڑھایا اور نشانہ باندھ کر چلّے کو اپنے کان کی لو تک کھینچا۔

"سن ــــ" کی آواز کے ساتھ تیر نکلا، اور چشم زدن میں آموں کا گچھا لہراتا ہوا اُن کے پاس آگرا۔ دواریپال مُنہ کھولے آم کے گچھے کو دیکھتا رہ گیا۔

ایک لویہ جھک کر اُسے پرنام کر رہا تھا۔

اتنے میں اندر سے کچھ شور سُنائی دیا۔ دواریپال نے چونک کر گردن گھمائی۔

"اوہو، آچاریہ دیو کی پالکی آ رہی ہے۔"

اُس نے ہرنیہ دھنش اور ایک لویہ کو پرے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اور خود نیام سے تلوار کھینچ کر تلوار کو اپنے چہرے کے مقابل پکڑے چاق و چوبند کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں چار کہار ایک سنہری پالکی اُٹھائے تیز تیز قدموں سے دوار کے باہر نکلے۔

پالکی میں راج گرو درونا چاریہ براجمان تھے۔

ریشمی دھوتی، گلے میں جنیئو، ماتھے پر تلک، سر پر مُکٹ، ہاتھوں میں باہو تران، کانوں میں جگ مگ کرتے رتن جڑت کرنابھوشن ــــ راج گرو کے مُکھ پر ایسا تیج تھا کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ پالکی کے پیچھے دو انگ رکشک لمبے لمبے نیزے تھامے چل رہے تھے۔ ہرنیہ پالکی کے سامنے آگیا اور اُس نے راج گرو کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر ماتھا ٹیک دیا۔ نیزہ بردار سپاہی لپکے اور اُسے فرش سے کھینچ کر اُٹھایا۔

ہرنیہ گڑگڑایا۔

"گرو دیو ایک بنتی سُن لیجئے۔"

سپاہی اُسے کھینچ کر ایک طرف لیجانے لگے مگر وہ بار بار گڑگڑا رہا تھا۔

"گرو دیو صرف ایک بار ــــ میری بنتی سُن لیجئے صرف ایک بار ــــ پھر چاہے جو سزا دیجئے۔"

راج گرو تھوڑی دیر تک اپنی چمکیلی آنکھوں سے ہرنیہ کو دیکھتے رہے۔ پھر ہاتھ اُٹھا کر اُسے

چھوڑ دینے کا اشارہ کیا۔ سپاہیوں نے اُسے چھوڑ دیا۔

ہرنیہ نے ایک بار پھر فرش پر ماتھا لگائی۔ درونا چاریہ کے آگے گڑگڑانے لگا۔

"دیوراج میں ہرنیہ دھنش بھیل ہوں۔ یہ میرا اکلوتا لڑکا ایکلویہ ہے۔ دھنُر ودیا سیکھنے کی بڑی اِچھا ہے اس کی۔ سرکار اگر اپنے چرنوں میں جگہ دے دیتے تو یہ اپنی منوکامنا پوری کر سکتا تھا۔ سرکار کرودھ نہ کریں۔ میں جانتا ہوں یہ دُساہس ہے۔ مگر بال ہٹ کے آگے وِوش ہو گیا گرو راج!

راج گرو درونا چاریہ نے نظر اٹھا کر ایکلویہ کی طرف دیکھا، ایکلویہ نے تُرنت جھک کر پرنام کیا۔
راج گرو نے اُسے پاس آنے کا سنکیت کیا۔

"تم دھنُر ودیا سیکھ کر کیا کرو گے؟"

"جنگل میں پشوؤں سے اور بستی میں شترُوؤں سے اپنی رکشا کروں گا۔"

"جانتے ہو دھنُر ودیا کیول کشتری کماروں کو سکھائی جاتی ہے۔ بھیل ہو کر دھنر ودیا سیکھنے کی بات کرتے ہو۔ اس اپرادھ کے بدلے تمہیں پران دنڈ دیا جا سکتا ہے۔"

"گرو دیو! آپ آگیا دیجئے۔ میں ابھی آپ کے چرنوں میں اپنے پران نچھاور کر دوں گا۔"

راج گرو درونا چاریہ بے ساختہ مسکرا دیئے۔

"بھیل پُتر تم بہت چالاک ہو۔ ہم تمہیں دھنر ودیا نہیں سکھا سکتے۔ یہ ہمارے نیموں کے وِرُدھ ہے۔ پرنتو تمہیں آشیرواد دیتے ہیں۔"

گرو دیو درونا چاریہ نے سپاہیوں کو سنکیت کیا۔ سپاہی بھیل کو چھوڑ کر ہٹ گئے۔ کہار پالکی لے آگے بڑھ گئے۔ ایکلویہ اپنے باپ کے ساتھ گرو دیو درونا چاریہ کی پالکی کو جاتے دیکھتا رہا۔ جب پالکی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو دونوں باپ بیٹے جنگل کو لوٹ گئے۔

کہتے ہیں کہ بعد میں ایکلویہ نے جنگل میں گرو دیو درونا چاریہ کی مٹی کی مورتی بنائی اور اُسے ساکشات گرو مان کر دھنر ودیا کا ابھیاس کرتا رہا۔ اور سچ مچ ایک دن دھنر ودیا میں لاثانی ہو گیا۔

پھر یوں ہوا کہ ساڑھے تین ہزار برس کے بعد ایکلویہ نے ایک غریب مزدور کے گھر میں جنم لیا۔ اس مزدور کا نام بھی ہرنیہ دھنش تھا۔ ایکلویہ جب پانچ برس کا ہوا تو ہرنیہ دھنش نے اُسے ایک میونسپل اسکول میں داخل کیا۔ ایکلویہ بڑا ہونہار طالب علم تھا۔ وہ رات دن دل لگا کر پڑھتا۔

خوب محنت کرتا اور ہمیشہ اوّل نمبر سے کامیاب ہونے کی کوشش کرتا۔ اُس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے۔ جب اُس نے ہائر سیکنڈری میں ٹاپ کلاس کر لیا تو ہرییہ اُسے لے کر ایک میڈیکل کالج میں پہنچا۔

اتفاق کی بات گرو دیو درونا چاریہ ہی اُس کالج کے پرنسپل تھے۔

یک لویہ نے داخلہ فارم پُر کیا۔ اُس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ گرو دیو دروناچاریہ نے اُسے اپنے کیبن میں بُلایا۔ اُنہوں نے ہرییہ دھنش اور یک لویہ کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ اور مسکرا کر بولے۔

"آؤ یک لویہ آؤ ——" پھر ہرییہ سے بولے —"کیوں ہرییہ کیسے ہو؟"

"ایشور کی کرپا ہے مہاراج!"

"آج کل کیا کرتے ہو ہرییہ —— ؟"

"ایک مِل میں مجوری کرتا ہوں سرکار!"

"ہم —— مجوری کرتے ہو اور اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا چاہتے ہو کیوں؟"

"آپ کی کرپا درسٹی ہوئی تو یہ جرور ڈاکدر بن جائے گا مہاراج۔"

"ایسا نہ کہو ہرییہ۔ تم نہیں جانتے ہم آج بھی کتنے مجبور ہیں۔"

"آپ کی کیا مجبوری ہو سکتی ہے سرکار؟"

"ہرییہ تم ساڑھے تین ہزار برس کے بعد بھی مورکھ ہی رہے۔"

"سرکار، چھوٹا منہ بڑی بات۔ اُس وقت ہمارا جنم شُودروں میں ہوا تھا مگر آج تو ہم شُودر نہیں ہیں۔ یک لویہ کو اپنا شِشیہ بنانے میں اب کیا کٹھنائی ہو سکتی ہے۔"

"یہی تو گڑبڑ ہے ہرییہ! زمانہ بدل چُکا ہے۔ تم آج بھی شُودر یا ہریجن ہوتے تو میں آنکھیں بند کر کے یک لویہ کو بی۔ سی کے کوٹے سے سیٹ دے دیتا۔ مگر اب اڑچن یہی ہے کہ تم شُودر نہیں ہو۔ یک لویہ بڑا ابھاگا ہے۔ جب اُسے کسی برہمن یا کشتری کے گھر میں جنم لینا چاہئے تھا اُس نے شُودر کے گھر جنم لے لیا۔ اور جب اُسے ہریجن کے گھر میں جنم لینا تھا تو پیدا ہوا غیر ہریجن کے گھر میں۔ اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

" سرکار کچھ بھی کیجئے ۔ اس بار نراش مت لوٹائیے ۔ بڑی آشائے کر آیا ہوں آپ کے چرنوں میں ۔"

" ہم مجبور ہیں ہریہ ۔"

" سرکار ۔"

" چپراسی ۔" پرنسپل درونا چاریہ نے چپراسی کو آواز دی ۔

چپراسی لپک کر اندر آیا ۔

" دوسرے اُمیدوار کو بھیجو ۔"

درونا چاریہ نے ہریہ اور ایک لویہ کی طرف سے مُنہ پھیر لیا ۔

چپراسی نے ہریہ اور ایک لویہ کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور دوسرے اُمیدوار کا نام پکارنے لگا ۔ ●●

تصویر

وہ شام بھی اور شاموں جیسی شام تھی۔ رنگین، اداس، روشن ملیح، کچھ اساتی، کچھ جاگتی، کچھ گہراتی، کچھ جگمگاتی۔ اُس شام بھی وہ چاروں اس بار میں داخل ہوئے جس میں برسوں سے آتے اور پیتے۔ بے تھے اور اُس میز کے گرد بیٹھ گئے جو عرصے سے انہیں کے لیے مختص تھی، انہوں نے بیزار مسکراہٹوں کے ساتھ ایکدوسرے کا استقبال کیا، ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ گھسے پٹے فقروں میں ایک دوسرے کی خیریت پوچھی اور ٹانگیں پھیلا کر کرسیوں کی پشت سے ٹیک کر بیٹھ گئے۔ وہ چاروں الگ الگ ٹھکانوں پر رہتے تھے۔ اُن کے نام اور ذاتیں الگ تھیں۔ مذہب اور مسلک بھی الگ الگ تھے۔ حلیے اور پیشے کے اعتبار سے بھی وہ مختلف تھے مگر روزانہ شام کو اس بار میں وہ چاروں اس طرح وارد ہوتے جیسے وہ ایکدوسرے کی پرچھائیں ہوں اور ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچے ہوں۔ بار کے دوسرے گاہک بھی ان چاروں کو ایک ساتھ دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ وہ انہیں الگ الگ ناموں سے یاد کرنے کی بجائے 'فور اسکوائر' کے اجتماعی نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں وہ چاروں حالات کے سمندر میں غوطے کھاتے۔ پاٹ پاٹ ڈوبتے گھاٹ گھاٹ ابھرتے، رُلتے، گھسلتے کس طرح اس بار میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ مگر اب چاروں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ دوسروں کے نزدیک ایک جان چار قالب ہو کر رہ گئے تھے۔

ان چاروں کے پیشے الگ تھے مگر ان میں ایک بات مشترک تھی کہ چاروں اپنے اپنے

پیشے میں ہر لحاظ سے ناکام تھے غالباً یہی ناکامی ان کی قربت کا سبب بھی بن گئی تھی۔ مگر ایسا
نہیں تھا کہ وہ کامیابی کے لئے کوشاں نہیں تھے۔ اُن کی صبحیں، اور ان کی شامیں، ان کے دن اور
ان کی راتیں، ان کے ماہ اور ان کے سال شاید کوشش اور جستجو میں گزرے تھے اور گزر رہے تھے۔
تاہم ان کی ہر جد و جہد کا نتیجہ ناکامی اور ہر کوشش کا انجام نامرادی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چاروں
شادی شدہ تھے۔ چاروں کے بیوی بچے تھے۔ عزیز و اقارب تھے۔ مگر اب ان کی بیویاں ان سے
بیزار، بچے متنفر اور عزیز و اقارب بدگمان ہو چکے تھے۔ وہ چاروں بھی ایک دوسرے سے بیزار
اور بدگمان تھے مگر وہ کیا کر سکتے تھے کہ چاروں ایک ہی کشتی میں سوار تھے اور کشتی کے بادبان ٹوٹ
چکے تھے، پتوار چھوٹ چکے تھے اور رات اندھیری تھی اور سمندر متلاطم تھا اور طوفان کے جھکڑ چل رہے
تھے اور چاروں اپنی کشتی کے خود ہی مسافر تھے اور خود ہی ملاح۔

وہ چاروں روزانہ بلا ناغہ اس بار میں جمع ہوتے، اپنی مخصوص میز پر بیٹھتے، شراب کا آرڈر
دیتے اور دن بھر کی تھکن، ذلت، ناکامی اور نامرادی کو گھونٹ گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگتے۔
پہلی سپ کے ساتھ ہی اُس نامہرباں، ستم پیشہ، عربدہ جو، وفا ناآشنا کا گیت چھیڑ دیتے جس
کا وصل اُن کے لیے ایک خواب تھا اور جس کی تعبیر کی حسرت اُن کا مقدر تھی۔ اور اس خواب اور
حسرتِ تعبیر کے درمیان کے پل کو عبور کرتے اُن چاروں کے جسم ٹُبر ٹُبر گئے تھے۔ جذبے ماند پڑ گئے
تھے اور ذہنوں پر پھپھوند جم گئی تھی۔ گیت کے اختتام کے بعد اُن کی جھنجھلاہٹ اور ان کا غصہ، ان
کی ناکامیاں اور ان کی نامرادیاں خاک بسر شکنیں، درکف در دہاں جملوں کی شکل میں ان کے ہونٹوں سے
خارج ہونے لگتیں۔ وہ اپنی شکستگی، بدحالی، مایوسی اور خانماں بربادی کو ایک دوسرے کے سامنے اس
طرح گلوری فائی کرتے کہ ایک دوسرے کے لیے قابلِ نفرت بہروپ بن جاتے۔ وہ شراب کے
ایک ایک جرعے کے ساتھ عضو عضو ٹوٹتے اور پارہ پارہ بکھرتے، بار کے دوسرے گاہک حیرت
اور دلچسپی سے ان کا گیت سنتے، گفتگو پر غور کرتے ان کے ایک ایک لفظ پر داد و تحسین
کے ڈونگرے برساتے۔ آہ اور واہ کے نعرے بلند کرتے، اپنا اپنا گلاس اٹھا کر کبھی ہنستے
کبھی روتے اپنے اپنے گھروں کو سدھار جاتے۔ مگر وہ اپنی میز پر اُس وقت تک جمے رہتے
جب تک بار کا ویٹر بار کے بند ہونے کا اعلان نہ کرتا۔ ویٹر کا اشارہ پاتے ہی چاروں

میز سے اُٹھ جاتے، ایک دوسرے کا سہارا لیتے، سہارا دیتے، لڑکھڑاتے، سنبھلتے اور سنبھلنے کی کوشش میں مزید لڑکھڑاتے باہر نکلتے پھر کسی ٹھیلہ گاڑی پر بریڈ آملیٹ یا پاؤ بھاجی زہر مار کرتے۔ اگر کسی کی جیب میں فاضل پیسے ہوتے تو کسی سیکنڈ گریڈ ریسٹورنٹ میں جاکر بریانی پایا اڑاتے، کلکتہ نورتن پان کے بیڑے کلّوں میں دباکر سگریٹوں کے کش کھینچتے، اپنے اپنے روٹ کی بسوں اور رکشوں پر سوار ہوکر اپنے اپنے ٹھکانوں پر روانہ ہوجاتے۔ گھروں پر بھی اُن سب کی کنڈیشنز ایک جیسی تھیں۔ چاروں جھومتے جھامتے، گرتے سنبھلتے، اپنے اپنے گھروں پر پہنچتے۔ اُن کی سوتی جاگتی نیم غنودہ بیویاں یا گہری نیند میں ڈوبے اُن کے سرکش بچے اُٹھ کر ان کے لیے دروازہ کھولتے۔ وہ مجرموں کی طرح گردنیں جھکائے اپنے دن بھر کے اعمال اپنی بغلوں میں دبائے گھروں میں داخل ہوتے۔ بیویوں کی جھنجھلاہٹ اور بچوں کی نفرت کو اُتار کر ہینگروں پر ٹانگ دیتے اور یہ بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اُن کے بچے مسہریوں کے نیچے دُبکے سو رہے ہیں یا سونے کا سوانگ کر رہے ہیں، یہ اپنی بیویوں کے چپ چپے گداز، بدہیئت سڈول برفیلے آگ جسموں سے لپٹ کر سو جاتے۔ اُن کی بیویاں بھی بیویوں کی طرح تُند خو، زود رنج مجبور، مظلوم اور حسرتوں کی اسیر تھیں۔ ہر چند کہ روزانہ وہ اپنے صحیح وسالم وجود کے ساتھ بیویوں کے پہلوؤں میں لیٹ جاتے مگر ان کے معصوم، ہونق، وفاپرست مجبور بیویاں ان کے اندرونی ملال اور باطنی شکست سے یکسر بے خبر تھیں۔ وہ تو صرف اتنا جانتی تھیں کہ روزانہ رات کی تاریکی میں دروازے کی کُنڈی بجاکر، لڑکھڑاتے قدموں سے اُن کے گھر میں داخل ہونے والا، دن بھر کی تھکن، ذلّت اور دھتکار کو اُن کی تھل تھل، جھرجھر، پیپول پچکی باسی کوکھوں میں ڈال کر اُن کے معطّر، متعفّن، بدہیئت، سڈول، برفیلے آگ بدن جسموں سے لپٹ کر سو جانے والا سوائے اُن کے شوہر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

تو وہ شام بھی اور شاموں جیسی شام تھی۔ رنگین ڈاس، روشنی میں کچھ ساقی، کچھ جاگتی، کچھ گہری کچھ جگمگاتی، اُس شام بھی وہ چاروں اس میز کے گرد آکر بیٹھ گئے۔ جو انہیں کے لیے مختص تھی۔ انہوں نے حسب معمول بیزار مسکراہٹوں کے ساتھ ایک دوسرے کا استقبال کیا۔ ڈھیلے ڈھالے مصافحوں کا تبادلہ کیا، گھسے پٹے فقروں میں یک دوسرے کی خیریت پوچھی اور ٹانگیں پھیلاکر کرسیوں کی پُشت سے ٹیک کر بیٹھ گئے۔ ویٹر نے آکر اُن کی میز پر شراب اور لوازمات شراب سجا دیے۔ ایک نے ہاتھ

بڑھ کر گلاسوں میں شراب ڈھالی، دوسرے نے برف کے ڈلے چھوڑے، تیسرے نے سوڈا واٹر ملایا۔ تب تک چوتھے نے گزک کو پلیٹوں میں چن دیا۔ پھر چاروں نے اپنے اپنے گلاس بلند کیے "چیرز" کی غم رُبا آواز کے ساتھ چاروں نے سُست و سبک، سادہ و پرکار شراب کے تلخ و شیریں گھونٹ لیتے اپنے حلق سے نیچے اتارے۔ چاروں کے چہرے تاب ناک ہو گئے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کے دیے لو دینے لگے۔ چاروں نے حسبِ معمول اس عربدہ جو، ستم پیشہ نامہربان ۔۔۔ نا آشنا کا گیت چھیڑ دیا۔

وہ دن سونا اور رات چاندی
صبح مُطلّا، شام مُجلّا
روش روش، قدم قدم
سورج اگاتی، چاند جگاتی
یاس کی دہلیز پر آس کے دیے جلاتی
رُلاتی، ہنساتی، ہنسا کر رُلاتی
آتی ہے مگر نہیں آتی۔
نہ وہ لعبتِ چین ہے، نہ فتنۂ فرنگ
نہ حورِ عرب ہے نہ ماہِ عجم
نہ وہ شیریں ہے نہ لیلیٰ
نہ سوہنی ہے نہ ہیر
اُس کا کوئی نام نہیں ـــــــ ہر نام اس کا ہے
اُس کا کوئی گھر نہیں ـــــــ ہر گھر اس کا ہے

بار کے دوسرے لوگ سی حیرت و مسرت سے ان کا گیت سنتے رہے۔ گیت کے اختتام پر ادھر اُدھر سے آہ اور واہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے بار کے موٹے بھدے مالک نے نوٹیں گنتے گنتے ہاتھ روک لیا۔ کچھ دیر تک اپنا گنجا سر دم بخود شنیدن بجائے ہمہ تن گوش کھڑا رہا۔ مگر جب کوشش کے باوجود ادراک کا ایک بھی مرغ زیرِ دام نہ آیا تو بڑ بڑایا، کچھ کھسیایا، کچھ جھنجھلایا

اور دوبارہ زینٹیں گننے میں محو ہوگیا۔ گیت ختم کر کے چاروں نے ایک ہی سانس میں اپنے اپنے گلاس خالی کیے۔ پھر ایکدوسرے کی طرف کچھ اپنائیت، کچھ اجنبیت، کچھ نفرت، کچھ محبت سے دیکھا۔ گلاسوں کو میز پر رکھا، ایکدوسرے کی سگریٹ سے اپنی اپنی سگریٹ جلائی اور حسب معمول اپنی روزانہ کی ناکام سرگرمیوں کا جائزہ لینے لگے۔ گفتگو کی ٹکسال میں لفظوں کے سکّے ڈھلنے لگے۔ رات کے اندھیرے کی طرح نشہ بھی دھیرے دھیرے گہرا ہونے لگا۔ چاروں نشے کے سمندر میں کبھی ڈوبتے، کبھی ابھرتے، کبھی جاگتے، کبھی سوتے، جام پر جام لنڈھاتے رہے۔ ایک ایک کر کے بار کے سارے گاہک رخصت ہوگئے۔ چاروں بار میں اپنی میز پر تنہا رہ گئے۔ تبھی یک بیک بار کا دروازہ کھُلا، اور ایک نسوانی پیکر بار میں داخل ہوا۔ وہ آنکھیں پھاڑے حیرت اور استعجاب کے سمندر میں غوطے کھاتے ایک آنکھ حیران ایک آنکھ پریشان ایکدوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ نسوانی پیکر کسی جل پری کی مانند تیرتا ہوا ان کے قریب آگیا ــــ

" تو ــــ تو کون ہے ؟"

انہوں نے ہکلاتے ہوئے پوچھنا چاہا۔

" میں وہی خواب ہوں جو تمہاری پلکوں پر منجمد ہوگیا ہے، اور جس کی حسرتِ تعبیر سے تمہارے دل مسلسل دھڑکتے رہتے ہیں۔"

چاروں تھوڑی دیر تک اس شہرِ بدن کے بُرج و مینار، منبر و محراب کا نظارہ کرتے رہے۔ ان کی نظریں اس کے جسم کے قوسین کا جائزہ لیتیں، ڈھلوانوں سے پھسلتیں، چٹانوں سے ٹکراتیں اس کی نگاہوں کے جال میں آکر اُلجھ گئیں۔ اُس کی نگاہوں میں کچھ ایسا بلاوا تھا کہ اُن کی خوابیدہ حسرتیں انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگیں۔ اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں، باچھیں چر گئیں، دانت جھانکنے لگے، مُنہ سے کف اڑنے لگا۔ برسوں کے ناآسودہ جذبے سینے کی لحد میں لیٹے لیٹے ڈراکیولا بن گئے تھے۔ چاروں نے جھپٹ کر اُسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ صراحی گردن، پھول رخسار، ہرنی آنکھیں، صندل باہیں، چندن ٹانگیں ــــ وہ اُسے اس طرح نوچنے کھسوٹنے لگے کہ تیشم زدن میں وہ شیشہ بدن چور چور اُن کے سامنے ڈھیر تھا۔

جب بار کا ویٹر خالی گلاس سمیٹنے ان کی میز کے پاس آیا تو خوف اور حیرت سے دیکھا کہ چاروں

آنکھیں موندے، ہونٹوں کو مقفّل، اور کانوں کو بند کیے گُم سُم بیٹھے ہیں۔ ویٹر نے انہیں جھنجوڑا، چاروں چونک پڑے، چونک کر آنکھیں کھولیں، خالی خالی نگاہوں سے ویٹر کو دیکھنے لگے۔ چاروں کے چہرے پر اُس مسافر کی سی تھکن تھی جسے یک طویل سفر درپیش ہو اور جس کے پاؤں زخمی ہو چکے ہوں اور راستہ پُرخار ہو اور سر پر دھوپ کی چادر تنی ہوئی ہو۔ ویٹر نے میز سے خالی گلاسوں کو سمیٹا، ان پر کھِلے پھول رخساروں، ہرنی آنکھوں، صندل باہنوں اور چندن ٹانگوں کو اُٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دینا چاہا۔ مگر انہوں نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ پھر چاروں نے اس ریزہ ریزہ بدن کو اُٹھایا۔ اُٹھا کر اپنے جھولے میں ڈالا اور جھومتے لڑکھڑاتے کھڑے ہو گئے۔ ویٹر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ چاروں باہر نکلے۔ باہر نکل کر ایک دوسرے کا سہارا لیتے، سہارا دیتے، لڑکھڑاتے سنبھلتے اور سنبھلنے کی کوشش میں مزید لڑکھڑاتے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

شام اب بھی آتی ہے۔ ویسی ہی رنگین اُداس، روشن میلی، کچھ اسی کچھ جاگتی، کچھ گھُرتی کچھ جگمگاتی۔ وہ چاروں اب بھی روزانہ اس بار میں اُسی میز کے گرد آ کر بیٹھتے ہیں۔ جو ان کے لیے مختص ہے۔ مگر اب وہ اس عربدہ جو ستم پیشہ، نامہرباں، دغا، آشنا کا گیت نہیں گاتے بلکہ گُم سُم، مہر بہ لب بیٹھے شراب پیتے رہتے ہیں۔ شراب پیتے پیتے اپنے جھولے سے ایک پھٹی ہوئی تصویر کے پُرزے نکالتے ہیں۔ اور ان پُرزوں کو کمال احتیاط سے اپنے سامنے میز پر پھیلا دیتے ہیں۔ پھر بڑے انہماک سے ان پُرزوں کو جوڑ جوڑ کر ایک تصویر بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہر بار جوڑ غلط لگ جاتے ہیں۔ آنکھوں کی جگہ ہونٹ، ہونٹوں کی جگہ گردن، باہنوں کی جگہ ٹانگیں، ٹانگوں کی جگہ باہنیں، ہزار کوشش کے باوجود وہ تصویر کو صحیح طور سے جوڑ نہیں پاتے حتیٰ کہ بار کے بند ہونے کا وقت ہو جاتا ہے۔ ●●

سبق

ڈم ، ڈم ، تڑاخ ——

ڈم ، ڈم ، تڑاخ ——

ایک دُبلا پتلا لمبا سا شخص گلے میں بڑا سا ڈھول لٹکائے دائیں ہاتھ میں پکڑے نیم کی خشک چوب سے ڈھول پر ایک خاص انداز سے ضربیں لگاتا آگے آگے چل رہا تھا۔ اُس کے سر کا اگلا حصّہ مُنڈا ہوا تھا مگر پچھلے حصّے کے بال ایک چوٹی کی شکل میں گندھے ہوئے اس کی گدّی پر جھول رہے تھے۔ ڈھول کی ہر ضرب کے ساتھ اُس کی چوٹی گلہری کی دُم کی طرح اِدھر اُدھر ہوا جاتی۔ اس کے بدن پر صرف ایک سفید دھوتی تھی اور گلے میں جنیئو پڑا ہوا تھا۔ وہ اس قدر دُبلا تھا کہ دُور سے ایک استخوانی پنجر معلوم ہوتا تھا جس پر محض چمڑا منڈھ دیا گیا ہو۔

رسّی کی طرح بٹے ہوئے لمبے لمبے ہاتھ اور سوکھی ٹانگیں جن میں بلا کی پھرتی تھی۔ گدھ کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی لمبی ناک، آنکھیں اس قدر اندر کو دھنسی ہوئیں گویا کسی گہرے کنوئیں میں دو موتی چمک رہے ہوں۔ اس کی کنپٹیوں سے پسینے کی دھاریں بہہ بہہ کر ٹھوڑی تک چلی آتی تھیں اور ماتھے پر کیسر اور گلال کی موٹی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اُس کے ڈھول پر بھی گلال چھڑکا ہوا تھا اور وہ اُچھل اُچھل کر ایک جنونی کیفیت کے ساتھ ڈھول بجا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو شخص نفیریاں بجاتے چل رہے تھے۔ ایک گدھے کی پشت پر ایک بڑا سا نقارہ لدا تھا۔ اور دو شخص دائیں بائیں نقارے کو سہارا دیئے چل رہے تھے۔ نقارہ ابھی خاموش تھا۔

نقارہ بردار گدھے کے پیچھے موٹی توندوں اور منڈے سروں والے پانچ برہمن اپنے دائیں ہاتھ میں پیتل کے چمچماتے کمنڈل اور بائیں میں مورچھل لیے تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ ان پانچوں میں سے ایک جو غالباً رتبے میں چاروں سے بڑا تھا۔ ہر تیس چالیس قدم کے فاصلے پر رک کر سنکھ پھونکتا۔ جس کی تیز آواز ڈھولوں کی 'ڈم ڈم تڑاخ' سے مل کر ایک عجیب ڈراؤنا تاثر پیدا کرتی۔

برہمنوں کی پیشانیوں، بازوؤں اور سینے پر بھبوت سے دو دو لکیریں کھنچی ہوئی تھیں مگر سنکھ بردار برہمن کے ماتھے پر تین لکیریں تھیں۔

ان تماموں کے پیچھے وہ گھوڑے پر سوار چل رہی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی گھوڑے کی سواری نہیں کی تھی۔ اسے خود تعجب ہو رہا تھا وہ گھوڑے پر کسی منجھے ہوئے شہسوار کی طرح تنی بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک ناریل اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا اور اس کے دونوں پاؤں رکاب میں پھنسے ہوئے تھے۔ کوئی آگے آگے نکیل پکڑے چل رہا تھا۔ ایک بار اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ وہ حیرت اور خوف سے کانپ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر تو مسکراہٹ تھی ـــ اس نے ایک بار پھر آئینہ دیکھا ـــ واقعی آئینے میں جو چہرہ دکھائی دے رہا تھا ـــ اسی کا تھا ـــ مگر یہ مسکراہٹ؟ یہ مسکراہٹ ہرگز اس کی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ آئینے میں برابر مسکرائے جا رہی تھی۔ یہ کیسی مسکراہٹ تھی جس پر اسے خود قابو نہیں تھا۔ دل خوف سے لرز رہا تھا مگر مسکراہٹ تھی کہ ہونٹوں سے جھرنے کی طرح پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آئینہ دیکھا۔ ماتھے پر بندیا، ناک میں نتھ، گلے میں جگ مگ جگ مگ کرتا قیمتی طلائی ہار، کان میں بندے جن میں جڑے یاقوت پارے سورج کی کرنوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، ہاتھ میں کنگن، بدن پر زربفت کی ساڑی جس پر نگاہ کا ٹھہرنا محال، نکھ سے شکھ تک سولہ سنگھار یں ڈوبی، چہرہ ہلدی، کنکو اور چندن کی روش سے کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھنے میں ایسی محو تھی کہ اسے ارد گرد کی سدھ نہ رہی۔ اچانک سنکھ کی آواز سے چونکی۔ آگے آگے چلنے والے برہمن رک گئے تھے اور وہی سنکھ دھاری برہمن داہنا قدم آگے بڑھائے دونوں ہاتھوں میں سنکھ تھامے کمر جھکائے پھلا پھلا کر سنکھ پھونک رہا تھا۔

'بھو ـــ او ـــ او ـــ و ـــ '

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے چلنے والے تمام افراد بھی رک گئے تھے۔

اب اُن میں سے اکثر کو وہ پہچان گئی تھی۔

وہ سفید کھچڑی بالوں والی بڑھیا جو ایک پیڑ کے نیچے کھڑی اپنی ہم عمر دوسری بڑھیوں سے دھیرے دھیرے بتیا رہی تھی اُس کی ساس تھی۔

"بہو سو کچھیا سے سہگمن کر رہی ہے"۔

"بہو ہو تو ایسی ہو۔ کُل کا نام روشن کر دیا"۔

"زندگی بھر پتی کی سیوا کرتی رہی اور اب ......"

وہ دس دس گیارہ گیارہ برس کے دو لڑکے جنھوں نے چُست کپڑے پہن رکھے تھے اور جن کی کمروں سے تلواریں بندھی تھیں، دونوں اُس کے دیور تھے ۔۔۔ اُس کی جوان نند بھی اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں خوب چہک رہی تھی۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے بھی ۔۔۔ عزیز رشتے دار، سہیلیاں، محلّے والے ۔۔۔ مگر حیرت اس بات پر تھی کہ کسی کے چہرے پر ذرا ملال نہیں تھا۔

دو دو چار چار ٹولیوں کی شکل میں لوگ آتے، اس کے آگے ڈنڈوت کرتے اور کہتے ۔۔۔ "اے ستی سادھوی! تیری پوتر آتما کو ہم وندنا کرتے ہیں۔ آج تو اِیہ لوک سے سورگ لوک کو پرستھان کر رہی ہے۔ وہاں ہمارے ماتا پتا، سگے سمبندھیوں کو ہمارا پرنام کہنا ۔۔۔"

وہ مُسکرا کر جواب دیتی۔

"میں کہوں گی ۔۔۔ میں کہوں گی ۔۔۔ میرا مارگ اَڈِگ ہے۔ میرا فیصلہ اٹل ہے"۔

اب ڈھول اور نفیری کی آواز میں نقّارے کی لرزا دینے والی دھم دھم بھی شامل ہو گئی تھی۔

شاید اشنان تال قریب آ رہا تھا۔ پیچھے چلنے والے تمام عزیز رشتے دار مجیریاں بجاتے، تالیاں پیٹتے چل رہے تھے۔ بعض عمر رسیدہ لوگ زیرِ لب منتر بھی پڑھ رہے تھے۔ آخر سب کے سب ایک بڑے حوض کے پاس جا کر رُک گئے۔ حوض کے کنارے آدم قد جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اس کے چاروں کناروں پر چار گنبد بنے تھے۔ جن میں چار مورتیاں رکھی تھیں۔ حوض پر بڑے بڑے درخت اس طرح سایہ فگن تھے کہ حوض کے پانی پر دھوپ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

حوض کے قریب پہنچ کر اُسے گھوڑے سے اُتارا گیا۔ ڈھول نفیریوں اور نقارے کی آواز دم بدم بڑھتی جا رہی تھی اور سارا جنگل ان آوازوں سے گونج رہا تھا۔ درختوں پر بیٹھے پرندے پھڑپھڑا

پھڑپھڑا کر چیختے، شور مچاتے اِدھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ اس کی بوڑھی ساس آگے بڑھی اور اس نے جھک کر اُس کے کان میں کہا۔

"اُدھر —— اُس گنبد کے نیچے چل کر اشنان کر لو۔"

پھر چار سہاگن عورتوں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے گھیرے میں لے لیا، اور وہ ان کے ساتھ ایک بُرج گنبد میں داخل ہو گئی۔ یہاں درختوں کی چھاؤں کی وجہ سے خاصا اندھیرا تھا۔ گنبد میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، جو حوض کے پانی میں دُور تک ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ عورتوں نے جلدی جلدی اس کے زیور اُتارنے شروع کر دیئے اور سارے زیور ایک طرف ڈھیر کرتی رہیں۔ پھر ایک عورت آگے بڑھی اُس نے اُس کی چوڑیوں سے بھری دونوں کلائیوں کو اس طرح آپس میں ٹکرایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری چوڑیاں چھن چھن ٹوٹ کر حوض میں جھڑ گئیں۔ دوسری اُس کے گرد گھوم گھوم کر اس کی دھوتی کے بل کھولنے لگی۔ ایک نے اس کی چولی اُتار دی اور چند لمحوں میں ہی وہ مادر زاد ننگی ہو گئی۔ اُس نے حیرت، خوف اور حسرت سے اپنے جسم کو دیکھا۔ پورا بدن صندل کی شاخ کی طرح سڈول اور چمکدار تھا۔ بدن کے سارے قوسین اس طرح اُبھر آئے تھے کہ نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ خود اپنا حُسن دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ کلیجے میں ہوک سی اُٹھی۔ اور وہ اپنی چھلکتی چھاتیوں کو بانہوں میں چھپائے ایک ایک سیڑھی پانی میں اُترنے لگی۔ پانی بیحد ٹھنڈا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سمٹی، جھجکی پھر تیزی سے کمر تک پانی میں اُتر گئی اور جلدی سے ڈبکی لگا دی۔ جوڑے کو کھول کر پانی میں دھویا، گھنے سیاہ بال اس کے شانے، سینے اور پُشت پر اس طرح بکھر گئے کہ ناف تک کا حصہ بالوں سے ڈھک گیا۔ اس نے گن کر تین ڈبکیاں لگائیں اور حوض سے باہر نکل آئی۔ دو عورتیں ایک کوری سفید دھوتی لیے ہوئے آگے بڑھیں اور اُسے گردن سے گھٹنوں تک دھوتی میں لپیٹ دیا۔ پھر چاروں عورتیں اُسے سہارا دیے ہوئے گنبد کے باہر لے آئیں۔ ساس آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چاندی کا تھال تھا جس میں پانچ ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ایک طرف سُرمہ دانی رکھی تھی اور پاس ہی ایک بڑا سا موتی چمک رہا تھا۔ اس نے پانچوں ہیرے اور تھوڑا سا سُرمہ کوری دھوتی کے پلّو میں باندھا، موتی اُٹھا کر مُنہ میں رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر سورج کی طرف مُنہ کر کے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ہے لکشمی نارائن! مجھے دھیرج دے —— مجھے دھیرج دے —— مجھے دھیرج دے۔"

ڈھول اور نقارے کی دھمک اپنے پورے شباب پر تھی۔ تمام لوگ ایک بڑے سے کُنڈ کے گرد اکٹھے تھے۔ کُنڈ میں ایک چتا بنی ہوئی تھی جس پر ایک سجی سجائی میت رکھی تھی۔ اُس نے پہلی نظر ہی میت کو پہچان لیا۔ میت اس کے پتی کی تھی۔ پانچوں برہمن اشلوک پڑھ پڑھ کر چتا پر سرسوں کا تیل چھڑکنے لگے۔

"ستی استری چتا کی آگ میں جل کر پتی کو نرک کی آگ سے بچا لیتی ہے۔"

دو عورتیں اُس کے اور چتا کے درمیان ایک بڑی سی چادر تانے کھڑی تھیں۔

دفعتاً عورتوں نے چادر کا پردہ ہٹا دیا۔ سنکھ دھاری برہمن نے آگے بڑھ کر اُس سے کہا۔

"دیوی! تمھارے لیے سورگ کا دُوار کُھل گیا ہے۔ دیکھو تمھارا بھرتار، تمھاری پرتیکشا کر رہا ہے۔"

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور چتا کی طرف بڑھی۔ اُس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"یہ جوالا مجھے ڈرا نہیں سکتی۔ یہ اگنی مجھے ڈرا نہیں سکتی۔"

پھر وہ چتا پر چڑھ کر میت کے چرنوں میں بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے اگنی پرارتھنا کرنے لگی۔

"انو گچھامی بھرتار ویدھوبہ جیسے پیڑ تا۔ سیتہ مارگ پردانتے ....."

"ہے اگنی دیوا! میں رنڈاپے کے بھئے سے دُکھی ہو کر اپنے پتی کا انوگمن کر رہی ہوں۔ مجھے سیتہ مارگ پردان کر تاکہ اپنے پتی کا سہواس پرپت ہو۔"

معاً اُس کے دونوں دیور آگے بڑھے ایک چتا کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ دوسرا پائنتی۔ دونوں کے ہاتھوں میں جلتی مشعلیں تھیں۔ سنکھ دھاری برہمن کا اشارہ پاتے ہی دونوں نے چتا کو آگ دکھا دی۔ چتا دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

ڈم۔ ڈم۔ تڑاخ۔

ڈم۔ ڈم۔ تڑاخ۔

ڈھول بجانے والا اب چتا کے گرد رقص کرتا جھوم جھوم کر ڈھول بجا رہا تھا۔

آہستہ آہستہ شعلے بلند ہونے لگے اور اُس نے اپنے بدن پر آنچ کی حرارت محسوس کی۔

بے رحم شعلے سانپوں کی طرح پھنکارتے زبانیں پھیلاتے اُس کی سمت لپک رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ

شعلوں کا حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک ایک چیخ جو جانے کتنی صدیوں سے اس کے سینے میں قید تھی کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر حلق سے نکلی۔

"نہیں ــــ میں مرنا نہیں چاہتی ــــ میں اس لاش کے ساتھ بھسم ہونا نہیں چاہتی ــــ مجھے زندہ رہنا ہے ــــ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

مگر اس کی آواز ڈھول اور نقارے کے بے پناہ شور میں کسی نے بھی نہیں سُنی۔ خود اُسے بھی یہ آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ جب شعلوں کی زبانیں اُس کی چادر کو چاٹنے لگیں تو وہ یک بیک تڑپ کر اُٹھی ــــ

"مجھے مت جلاؤ ــــ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ــــ میں مرنا نہیں چاہتی ــــ میں مرنا نہیں چاہتی ــــ مجھے مت جلاؤ ــــ مجھے مت جلاؤ۔

برہمن زور زور سے اشلوک پڑھ رہے تھے۔

"پتی ورتا کو اشومیدھ کا پھل پراپت ہوتا ہے۔"

"جو استری پتی کے ساتھ ستی ہوتی ہے، وہ اپنے پتی کُل، پتا کُل اور ماتا کُل تینوں کُلوں کو پاون کرتی ہے۔"

"ستی استری ساڑھے تین کروڑ ورش تک تھا شریر پہ جتنے بال ہیں اُتنے ہزار ورش تک سورگ لوک میں نواس کرتی ہے۔"

اب شعلے چتا کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ اس نے لپک کر باہر نکلنا چاہا۔ تبھی کہیں سے ایک لمبے بانس نے اُسے بیچ کی طرف اُچھال دیا۔ اُس نے گھوم کر دوسری طرف رُخ کیا۔ وہاں سے بھی کسی نے اُسے بانس کا ٹھوکا دیا اور وہ پھر چتا کے اندر لڑھک گئی۔ اس کی چادر میں آگ لگ چکی تھی۔ اس نے چادر کو کھینچ کر دُور پھینک دیا۔ اب اُس کا عریاں صندلی جسم سُرخ شعلوں کے پس منظر میں کسی برق آسا بھبوکے کی طرح اِدھر سے اُدھر تڑپ رہا تھا۔ وہ اُٹھتی، گرتی، گر گر کر پھر اُٹھتی اور اُٹھ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی مگر ہر بار اُسے ایک لمبے بانس سے دوبارہ چتا میں دھکیل دیا جاتا۔ اس نے بلند ہوتے شعلوں کے پردے دیکھے۔ اُس کے دونوں دیور، نند، ساس، پانچوں

برہمن اور تمام عزیز رشتے دار لمبے لمبے بانس لیے چتا کو گھیرے کھڑے تھے۔ اور وہ جس طرف سے بھی باہر نکلنے کی کوشش کرتی کسی نہ کسی بانس کا سرا اس کے پہلو میں گڑتا اور چتا کے حوالے کر دی جاتی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اب وہ اس چتا سے باہر نہیں نکل سکتی۔ یہ لوگ اُسے اِس موت کے حصار سے باہر نکلنے نہیں دیں گے۔

تبھی اُس نے دیکھا کہ اس کے چاروں طرف بیلپاتے شعلے سیکڑوں ہزاروں کیکڑوں کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور وہ سارے کیکڑے اپنے تیز نکیلے ڈنکوں کے ساتھ اُس کے سینے، گردن، پیٹ، بازو اور رانوں سے یوں چمٹ گئے ہیں جیسے اُس کے جسم کا ریشہ ریشہ نوچ کر الگ کر دیں گے۔

یک بیک وہ چکرا کر اپنے پتی کی لاش پر گر پڑی۔

اُس کے پتی کا چہرہ چندن اور کیسر سے پُتا ہوا اور پیشانی پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اُس کا مُنہ کھُلا تھا اور گلے سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے اپنے اِردگرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس کی بوڑھی ساس، جوان نند اور دونوں دیور اپنے اپنے بستروں پر گہری نیند سو رہے تھے۔ کمرے میں اُن سب کی سانسوں کی آوازیں چڑیوں کی سرگوشیاں سی معلوم ہوتی تھیں۔ اُس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔ اُس نے ساڑی کے پلّو سے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ باہستگی بستر سے اٹھی۔ مٹکے سے ایک ڈونگا پانی لیا اور ایک ہی سانس میں غٹ غٹ پی گئی۔ پڑوس میں کسی کا گھڑیال ٹن ٹن چار بجا رہا تھا۔ اُس نے سوئے ہوئے شوہر کی جانب دیکھا۔ وہ اُسی طرح چیت لیٹا، اپنے گلے سے خرخر کی آواز نکال رہا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ صرف چار چھ مہینے کا مہمان تھا۔ کیکڑے کے سُرخ اور سبز پاؤں نرخرے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ اُس کا ہر سانس ہوا کی زد پر رکھے چراغ کی طرح کانپ رہا تھا۔ اُسے ایک لمحے کو اپنے شوہر کی اس حالت پر ترس آگیا۔ مگر جب اُس نے اُس کے لاغر جسم، استخوانی چہرے اور کھُلے مُنہ کی جانب دیکھا تو ایک انجانے جذبے کے زیرِ اثر لرز کر رہ گئی۔ کلیجے کو چیرتی ایک آہ اُٹھی مگر اس نے بڑی مہارت سے اُسے ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی کچل دیا۔ پھر ساڑی کا پلّو کمر میں کھونسا اور مُڑ کر چپ چاپ اسٹوو کو پمپ کرنے لگی۔ ●●

مُعبّر

قیدی کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے تھے۔ اور وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے ان اوبڑ کھابڑ اور تنگ پگڈنڈیوں پر مسلسل چل رہا تھا۔ بلکہ چلتے رہنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ تھکن اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی تھی۔ اور پیاس کی شدت سے گلے میں پھندے سے پڑتے جا رہے تھے۔ اس نے مڑ کر سپاہی کی جانب دیکھا جو بندوق تانے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قیدی کے یوں، چونک مڑتے ہی سپاہی نے فوراً بندوق کی نال اس کی جانب اٹھا دی۔

"کیا تم اپنے چھاگل سے مجھے دو گھونٹ پانی دے سکتے ہو؟"

اس نے سپاہی کے کاندھے سے لٹکی چھاگل کی طرف حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

سپاہی اس کی جانب بندوق تانے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ بندوق کی نال اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ سپاہی کا چہرہ پتھر کی سل کی مانند سپاٹ تھا۔ اس نے دوبارہ پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"مجھے صرف اپنا حلق تر کرنے کے لئے دو گھونٹ پانی دے دو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھاری چھاگل میں کافی پانی موجود ہے۔"

مگر سپاہی جس پوزیشن میں کھڑا تھا۔ اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔ اس نے جنبش تک نہ کی۔ نہ جواب میں اس کی زبان سے ایک لفظ ہی ادا ہوا۔ جیسے ان لفظوں کا تعلق کسی اور کی ذات سے ہو۔ یا وہ الفاظ اس کی سماعت کے تاروں کو چھیڑنے سے قبل ہی ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔

"دیکھو!" ..... ہزار ضبط کے باوجود قیدی کی آواز رقت سے تھرتھرا رہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے سپاہی کو دوبارہ مخاطب کیا۔

"ذبح کرنے سے قبل جانور کو بھی پانی پلایا جاتا ہے۔ کیا انسانیت کے ناطے تم مجھے چند قطرے پانی ......"

سپاہی کے ہونٹ ہلے اور اس کے حلق سے پتھر کے چٹخنے جیسی آواز پیدا ہوئی۔

"مجھ سے کسی چیز کا مطالبہ مت کرو۔ میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔ تمھیں پانی پلانا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔"

سپاہی کا چہرہ اسی طرح سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا۔

"تمھارا فرض ــــ" قیدی نے تلخ لہجے میں دوہرایا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھو کہ نہ تم کسی مشین کے پرزے ہو نہ میں راستے کا پتھر ہوں۔ ہم دونوں میں بحیثیت انسان کچھ قدریں مشترک ہیں۔ جن کا احترام ہم پر لازم ہے۔"

"وعظ مت کرو ــ تم کیا ہو اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ میں قانون کا محافظ ہوں۔ اور قانون کی حفاظت کرنا ہی میرا فرض ہے۔ جب تک میرے جسم پر یہ وردی ہے۔ مجھ سے کسی بھی قسم کی رعایت کی توقع رکھنا فضول ہے۔"

قیدی نے سپاہی کی وردی کی جانب دیکھا۔ پھر اپنی جانب اٹھی بندوق کی نال پر سے ہوتی اس کی نگاہ سپاہی کی نگاہوں سے ٹکرائی۔ پتھریلے چہرے پر شیشے کی دو گولیاں اب بھی غیر متحرک تھیں۔

"گویا تم بھی میری طرح قیدی ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری مشکیں رسّی سے بندھی ہیں۔ اور تم اپنے ہی اصولوں کی زنجیروں میں قید ہو۔"

سپاہی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک سپاہی کو بے بس نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر چپ چاپ مڑ کر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مگر پیچھے سے آتی قدموں کی چاپ سے اس نے اندازہ لگایا کہ سپاہی اس کے پیچھے برابر چلا آ رہا ہے۔ سورج ٹھیک ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ اور پسینے کی تلیاں

اس کے گلے، سینے اور پیٹھ پر سپیوں کی طرح رینگ رہی تھیں۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے دھول میں اٹے کپڑوں کو دیکھا۔ جوتوں پر بھی دھول کی ایک موٹی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ پیروں کو فرش پر پٹک کر جوتوں کی دھول اڑائے۔ مگر پھر اپنا ارادہ بدل دیا۔ دفعتاً سپاہی کی آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ۔" وہ رک گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے مڑ کر سپاہی کی جانب دیکھا۔

"وہ اُدھر دیکھو۔" سپاہی کی انگلی ایک جانب کو اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سامنے سبز گھنی جھاڑیوں کے اس پار سچ مچ ایک عالیشان عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ جس کے چاروں کناروں پر چار اونچی اونچی برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ برجیوں کے نکیلے سرے برچھیوں کی طرح آسمان کی سمت تنے ہوئے تھے۔ آسمان کانچ کی طرح بے داغ اور چمکیلا تھا۔ ایک چیل اڑتی ہوئی آئی اور کاوا کاٹ کر ایک محتاط بانکپن کے ساتھ بائیں طرف سامنے کی برجی پر بیٹھ گئی۔ دونوں گھنی جھاڑیوں کو پار کر کے عمارت کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ عمارت کا کوئی پھاٹک نہیں تھا۔ بس داخلہ کے لئے ایک بہت بڑی کمانی بنی تھی۔ اور اس کمان کے اوپر دونوں جانب دو شیروں کی شبیہیں یوں ایستادہ تھیں جیسے اگلے ہی لمحے جست لگا دیں گے۔ اس نے ایک نظر شیروں کی شبیہہ پر ڈالی۔ اور مڑ کر سپاہی کی طرف دیکھا۔ سپاہی نے اپنے سی ریتعلق انداز میں کہا۔

"اب آگے تم اکیلے ہی جاؤ گے۔"

"اور تم؟"

"میرا کام یہاں تک لانا تھا۔ سو میں لے آیا۔ اب آگے کا مجھے کوئی علم نہیں۔ یہاں سے میرے اختیارات کی حد ختم ہو جاتی ہے۔"

اور اس سے پہلے کہ قیدی مزید کچھ پوچھتا۔ سپاہی اپنی ایڑیوں پر گھوما اور ایک طرف کو چل دیا۔ وہ کچھ دیر تک سپاہی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب سوائے تنہا عمارت میں داخل ہونے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اندر قدم رکھنے سے پہلے اس نے گردن اٹھا کر ایک بار پھر شیروں کی شبیہہ کو دیکھا۔ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا۔ پھر خاموشی سے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے بہت بڑا پائیں باغ تھا۔ جس کے درمیان ایک خوبصورت فوارہ بنا تھا۔ فوارے کے بیچوں بیچ ایک عورت کا مجسمہ نصب تھا۔ جس کے سر پر مٹکی تھی۔

مٹکی سے ست رنگی پانی کی پھواریں پھوٹ رہی تھیں۔ دور سے یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے آسمانی دھنک کے بل کھل کر اس کے ساتوں رنگ فضا میں بکھر گئے ہوں۔ وہ قریب پہنچ کر تھوڑی دیر تک اس فوارے کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے چہرے پر بھی بوندوں کی ہلکی سی نمی محسوس کی۔ اور اس کا دل مسرت سے بھر گیا۔ اسے بڑا تعجب ہوا کہ اس کی وہ شدید پیاس یکلخت ختم ہو گئی تھی۔ وہ اسی مسرت سے سرشار ایک خوبصورت سی روش سے ہوتا ہوا عمارت کے صدر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ روش کے دونوں طرف رنگ برنگے پھولوں کے گملے سجے تھے۔ فضا میں پرندوں کی چہکار اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو تیرتی پھر رہی تھی۔ اس نے خوشبو کو سینے میں بھرا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کے چشمے میں اپنی سماعت کو غوطے دیئے۔ آنکھوں میں باغ کے ایک ایک منظر کو قید کیا۔ اور عمارت کے صدر دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر کوئی پہرے دار، سنتری نہیں تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے عمارت کے وسیع و عریض دالان میں قدم رکھا۔ قدم رکھتے ہی چاروں طرف سے ہلکی ہلکی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا آوازیں چھت اور دیواروں سے پھوٹ رہی ہوں۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ مگر گھنٹیوں کی آواز اتنی مترنم تھی کہ وہ بعد ازاں اسی کی لے پر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ عمارت کی چھت سے بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے۔ جن سے سرخ نیلی پیلی سبز مختلف قسم کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ پوری عمارت میں تاحدِ نظر اونچے اونچے ستون قائم تھے۔ ہر ستون ایک قوی ہیکل راکشش کی شکل میں تراشا گیا تھا۔ یہ سارے مجسمے ایک جیسے بدہیئت، ڈراؤنے اور عریاں تھے۔ ہر مجسمہ اپنے دائیں ہاتھ کی چٹکی سے اپنی زبان کو کھینچ کر پکڑے ہوئے تھا۔ اور بائیں ہاتھ کی انگلی سے اپنے زیر ناف کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اب گھنٹیوں کی آواز بند ہو چکی تھی۔ اور پوری عمارت میں ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اسے اپنے سانسوں کی آواز صحرا کی سرگوشیوں کی مانند سنائی دے رہی تھی۔ اس نے زور سے آواز دی۔ ارے کوئی ہے؟

ہر ستون کے پیچھے سے آواز آنے لگی "ارے کوئی ہے؟ کوئی ہے؟" کوئی ہے؟"

اس نے گھبرا کر اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ اس کے چاروں طرف بے جان اور مہیب ستونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا۔ اس کے قدموں کی چاپ ہال میں یوں گونج رہی تھی۔ جیسے سیکڑوں، ہزاروں لوگ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہوں۔ وہ رک گیا۔

چاپ بھی تھم گئی۔ وہ پھر دو قدم چلا۔ چاپ پھر گونجنے لگی۔ چٹ۔ چٹ۔

اس نے ایک بار پھر آواز لگائی۔

"میں آگیا ہوں ـــــ"

تھوڑی دیر تک اس کی یہ آواز بھی ہال میں گونجتی رہی "میں آگیا ہوں۔ میں آگیا ہوں۔ میں آگیا ہوں ـ" دھیرے دھیرے آواز کنوئیں میں ڈوبتے پتھر کی مانند تہہ آب ہوتی چلی گئی۔ اس نے دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑے ہال میں پہنچ گیا ہے۔ مگر ہال خالی پڑا تھا۔ اور چاروں طرف مہین سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے ہال کی پراسراریت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ معاً اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"تم آگئے! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔" اس نے تیور اکر سامنے نگاہ ڈالی۔ ہال کے دوسرے سرے پر کوئی شخص ایک اونچی کرسی پر بیٹھا اسی سے مخاطب تھا۔ وہ کرسی نشین اچانک یوں نمودار ہوا تھا۔ جیسے ہال کی پراسرار دھند نے اسے اُگل دیا ہو۔ اس کے سر پہ چھت سے ایک بڑا سا ترازو لٹک رہا تھا۔ جس کے دونوں پلڑے فضا میں ساکت تھے۔ اس کے جسم پہ ایک عجیب سا دوشالہ تھا۔ جس کا رنگ دھوپ چھاؤں کے امتزاج کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی تھی۔ اس کرسی نشین شخص کے چہرے کے نقوش کچھ اس طرح بن بگڑ رہے تھے کہ انہیں نظروں کی گرفت میں لینا بہت مشکل تھا۔ ہلکی سی دھند کا پردہ بدستور دونوں کے درمیان حائل تھا۔

اس نے کرسی نشین سے پوچھا۔ "مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔"

کرسی نشین نے ایک طرف کو انگلی اٹھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "جو کچھ کہنا ہے وہاں کھڑے ہو کر کہو۔" اس نے ادھر دیکھا جدھر کرسی نشین کی انگلی اٹھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک کٹہرا بنا تھا۔ اس نے ایک نظر کٹہرے پر ڈالی۔ پلٹ کر کرسی نشین کی جانب دیکھا۔ پھر خاموشی سے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہوگیا۔

کرسی نشین کی آواز آئی۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مجھے کٹہرے میں کیوں کھڑا کیا گیا ہے؟"

"تم ملزم ہو۔"

"یعنی میں کٹہرے میں کھڑا ہوں. اس لئے ملزم ہوں۔ یا ملزم ہوں اس لئے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہوں؟"

کرسی نشین ایک گرجدار ہنسی ہنسا۔

"لگتا ہے تمھیں لفظوں کا کھیل بہت پسند ہے۔ مگر یاد رکھو۔ لفظ بڑے دغاباز ہوتے ہیں۔ یہ آستین کے سانپ ہیں۔ ذرا غافل ہوئے پلٹ کر ڈس لیتے ہیں۔"

"لفظوں کے تعلق سے میرا تجربہ تم سے مختلف ہے۔" قیدی کا لہجہ اعتماد سے پُر تھا۔

"میں نے ہمیشہ لفظوں سے اس طرح معنی کشید کئے ہیں۔ جس طرح سڑے گلے پھلوں سے شراب کشید کی جاتی ہے۔ میں مُعبّر ہوں۔ لوگوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کس جرم کی پاداش میں مجھے یہاں لایا گیا ہے؟"

"ابھی تم نے اعتراف کیا ہے کہ تم لوگوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتاتے تھے۔"

"ہاں بتاتا تھا۔"

"یہی تمھارا جرم ہے۔"

"یعنی خوابوں کی تعبیر بتانا؟" قیدی کے لہجے میں استعجاب تھا۔

"ہاں خوابوں کی تعبیر بتانا ہمارے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے۔"

"اور خواب دیکھنا؟"

"نہیں خواب دیکھنا جرم نہیں۔ چونکہ خواب تو معصوم لوگ دیکھتے ہیں۔ اور تم تعبیر بتا کر ان سے ان کے خوابوں کی معصومیت تک چھین لیتے تھے۔ لہٰذا......" کرسی نشین چند لمحوں کے لئے رکا پھر اپنے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

"عدالت اس خطرناک جرم کی پاداش میں تمھارے لئے سزائے موت تجویز کرتی ہے۔"

"سزائے موت!" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"ہاں سزائے موت۔"

"مگر یہ سراسر ظلم ہے۔ ناانصافی ہے۔"

"اس کرسی پر بیٹھنے کے بعد ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ منصف ہے۔"

"میں ــــــ میں اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔"

"احتجاج ــــــ" کرسی نشین حقارت آمیز ہنسی ہنسا۔

"شاید تمہیں پتہ نہیں۔ تمہارے اندر پھنکارنے والے سانپوں کا سارا زہر کشید کیا جا چکا ہے اور تمہارے لہو میں دوڑنے والے بچھوؤں کے ڈنک توڑ دئے گئے ہیں۔ لہٰذا اس وقت تمہارا احتجاج اس جانور کی آخری چیخ کی مانند ہے۔ جو قصاب کی چھری کے نیچے آنے سے قبل اس کے حلق سے آزاد ہوتا ہے۔"

اتنا کہہ کر کرسی نشین کھڑا ہو گیا۔ اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا۔ ہال کے دائیں طرف ایک ستون کے پیچھے غائب ہو گیا۔ قیدی کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ وہ کافی دیر تک گردن نیوڑھائے چپ چاپ کھڑا رہا۔ دفعتاً اسے کل رات دیکھا ہوا خود اپنا ہی ایک خواب یاد آگیا۔ صبح وہ اسی خواب کی تعبیر پر غور کر رہا تھا کہ اسی وقت سپاہی نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ وہ خواب ایک بار پھر اپنی جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ ایک لق و دق صحرا جس پر تاحد نگاہ دھول اور ریت کے چھوٹے چھوٹے بگولے اڑ رہے ہیں۔ ایک طرف سے بھیڑوں کا ریوڑ آتا دکھائی دیتا ہے۔ ریوڑ کی حفاظت کی خاطر دائیں بائیں، آگے پیچھے چند خونخوار کتے لمبی لمبی زبانیں لٹکائے دوڑ رہے ہیں۔ بھیڑوں کی معمولی سی معمولی حرکت پر بھی ان کی کڑی نظر ہے۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ ریوڑ سے کٹ کر دوسری سمت مڑ گئی ہے۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوگی کہ ایک محافظ کتے کی نگاہ اس پر پڑ جاتی ہے۔ اور وہ غرا کر اس پر جست لگا دیتا ہے۔ کتے کے تیز نکیلے دانت بھیڑ کی گردن میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ دوسرے کتے بھی غراتے ہوئے اسی گمراہ بھیڑ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اسے اس طرح چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ چند لمحوں بعد وہاں دھول، بھیڑ کی ہڈیوں، ریت میں جذب ہوکے بڑے بڑے دھبوں اور بھیڑ کی بھوری کھال کے خون آلود چیتھڑوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ دیگر بھیڑیں سہمی ہوئی نظروں سے اس منظر کو دیکھتی ہیں۔ اور خوف و دہشت سے ایک دوسرے میں یوں سمٹ سکڑ جاتی ہیں کہ دور سے پورا ریوڑ زمین پر رینگتے ایک بھورے بادل کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ محافظ کتے اپنی اپنی سرخ زبانوں سے باچھوں پر لگے لہو کو چاٹتے دوبارہ دائیں بائیں آگے پیچھے پھیل

جاتے ہیں۔ ریوڑ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں دور تک اس ریوڑ کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ جو دھیرے دھیرے گرد و غبار کی کوکھ میں سما جاتا ہے۔

وہ کٹہرے میں کھڑا اپنے اس عجیب و غریب خواب کے تانے بانے بن رہا تھا کہ دفعتاً دور کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر گردن اٹھائی۔ ایک طویل القامت شخص سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس اس کے سامنے کھڑا تھا۔ صرف اس کی آنکھوں کی جگہ دو سوراخ بنے تھے۔ جن میں دو انگارے سے دہک رہے تھے۔ سیاہ پوش دو قدم اس کی جانب بڑھا اور کرخت آواز میں بولا۔

"میں یہاں کا جلاد ہوں۔ تمھارے آخری سفر کا انتظام میرے سپرد ہے"۔

دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں برابر آرہی تھیں۔ قیدی کچھ دیر تک سیاہ پوش کی جانب خالی خالی نظروں سے تاکتا رہا۔ پھر خود ہی زیر لب بڑبڑایا۔

"یعنی اب کوئی امید باقی نہیں رہی"۔

جلاد اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی کی چادر تنی رہی۔ پھر جلاد سماعت کو تحلیل دینے کی حد تک گونجتی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"تمھارا آخری وقت آچکا ہے۔ اس وقت کسی بھی قسم کا مشورہ تمھارے لئے فضول ہے۔ پھر بھی اگر تم اطمینان سے مرنا چاہتے ہو تو میری بات کو غور سے سنو"۔

قیدی لاتعلق انداز میں خاموش کھڑا تھا۔ جلاد کہہ رہا تھا۔

"انسان کے لئے امید ہی سب سے بڑا دکھ ہے۔ جب ساری مشعلیں بجھ چکی ہوں تو محض جگنوؤں کی روشنی کے سہارے سفر جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ میں اب تک سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں۔ میں اپنے اس تجربے کی بنیاد پر تم سے کہہ سکتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اپنے اندر کے سارے چراغ گل کردو۔ تاکہ اندھیرے میں تم جسم سے روح کے جدا ہونے کے منظر کو نہ دیکھ سکو۔ جو لوگ ہی آخری سانسوں تک امید کو گلے لگائے رکھتے ہیں۔ ان کی جان بڑی کشمکش سے نکلتی ہے۔ کیونکہ روح جسم سے علیحدہ ہونا چاہتی ہے۔ مگر امید خاردار جھاڑیوں کی طرح اس کے دامن سے لپٹ جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر روح دھجی دھجی ہوکر جسم سے جدا ہوجاتی ہے۔ اس لئے مرنے سے پہلے اپنی ساری امیدوں کا گلا گھونٹ دو۔ تاکہ موت بہ رضامندی تمھیں گلے لگا سکے"۔

سیاہ پوش جلاد خاموش ہوگیا۔ قیدی صورت حال کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس نے حقارت
سے جلاد کی جانب دیکھا۔ اور پرسکون لہجے میں بولا۔

"تم موت کے ہرکارے ہو۔ تم امید کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیا ہے" تم زندگی کے
بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ امید تو زندگی کا محور ہے۔ جو لوگ امید کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ موت
سے پہلے مرجاتے ہیں۔ میں ایک معتبر ہوں۔ جو خوابوں کو بھی حقیقت کے روپ میں دیکھتا ہے۔
میرے نزدیک زندگی اور موت دونوں اٹل حقیقتیں ہیں۔ لہٰذا تم اپنا وقت ضائع مت کرو۔ میں
اپنے آخری سفر کے لئے تیار ہوں۔"

"کیا تم واقعی موت سے خوف زدہ نہیں ہو؟"
جلاد نے بے یقینی سے پوچھا۔

اس زمین اور آسمان کے درمیان ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جہاں انسان کو موت کا
خوف نہ ہو۔ مگر جب مرنے والے پر موت کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے تو خوف دور کھڑا
کسی پالتو کتے کی طرح زبان لٹکائے ہانپتا رہتا ہے۔"

اتنے میں دور کہیں گجر کی آواز سنائی دی۔

"کیا یہ صبح کا گجر ہے؟" قیدی نے بیتابی سے پوچھا۔

ہاں یہ صبح کا گجر ہے۔ تمہاری زندگی کا آخری گجر۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی تمہاری
زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا۔ پھانسی کا پھندا تمہارے گلے میں ڈالنے سے پہلے رسم کے مطابق
میں تم سے تمہاری آخری خواہش دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

قیدی بے ساختہ ہنس [illegible]۔ تھوڑی دیر تک ہنستا رہا۔ پھر یک بیک جلاد کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈالتے ہوئے بولا۔

"واقعی تم میری آخری خواہش پوری کرو گے؟"

"اگر ممکن ہوا تو تمہاری آخری خواہش پوری بھی کی جاسکتی ہے"

"تو پھر سنو۔ میری آخری خواہش یہ ہے کہ میں تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں ـــ" جلاد گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"کیوں؟ گھبرا گئے" ۔ قیدی کے لہجے میں تمسخر تھا۔

سیاہ پوش جلاد زمین میں گڑی میخ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

"یعنی میرا شبہ سچ نکلا" ۔ قیدی کے ہونٹوں پر ایک بے باک مسکراہٹ تھی۔

"کیسا شبہ؟" جلاد کے لہجے میں ہلکی سی کپکپی تھی۔

"دراصل تم، جج اور سپاہی تینوں ایک ہی شخصیت کے تین الگ الگ روپ ہو۔ آؤ میرے گلے میں پھندا ڈال دو۔ تم دیکھو گے میں کتنے اطمینان سے مرتا ہوں۔ کیونکہ میرے آخری خواب کی تعبیر بھی سچ نکلی۔ اب موت میرے لئے ایک معمولی سی پھانس سے بھی کم تکلیف دہ ہے" ۔

قیدی براہ راست سیہ پوش جلاد کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ نقاب کے پیچھے جلاد کی آنکھیں کے دیئے ہواؤں کی زد پہ رکھے چراغوں کی طرح کانپ رہے تھے"۔

اور دور کتوں کے بھونکنے کی آواز لمحہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ○○

درمیانی صنف کے سورما

بڑا ہی حیرت ناک منظر تھا۔ حیرت ناک اور مضحکہ خیز۔ سڑک کی دو رویہ فٹ پاتھوں پر تماش بینوں کا ایک میلا سا لگ گیا تھا۔ مکانوں کے چھجوں، گیلریوں، چھتوں، اور دالانوں پر لوگ اُمڈے پڑ رہے تھے۔ سارا ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ لوگ سواریاں روکے، بسوں اور کاروں سے گردنیں نکالے حیرت اور دلچسپی سے اُس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ بچے تالیاں بجا بجا کر اُچھل رہے تھے۔ عورتیں منہ میں آنچل ٹھونسے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ایسا عجیب و غریب جلوس اُنہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ جلوس میں شریک سارے افراد درمیانی صنف سے تعلق رکھتے تھے۔ جلوس کے آگے آگے ایک طویل القامت ہیجڑا ایک لمبا سا بانس اُٹھائے چل رہا تھا۔ بانس پر سیاہ رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ بندھا ہوا تھا جو ہوا میں پرچم کی طرح لہرا رہا تھا۔ دوپٹے پر سلمی ستارے ٹنکے دھوپ میں جگ مگ کر رہے تھے۔ اُس کے پیچھے چلنے والے ہیجڑے تین تین کی قطار میں چل رہے تھے۔ وہ ساخت اور حُلیے کے اعتبار سے پہلی نظر میں اسپارٹا کے سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ بغیر آستینوں کے گھٹنوں تک لمبے جیکٹ، پیروں میں کاغذ کے مصنوعی جوتے، اور کمر میں کاٹھ کی ایک عدد تلوار۔ بیشتر کے ہاتھوں میں چوبی ڈھالیں تھیں اور اُن کی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں اُن کے کاندھوں پر دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔ ناکوں میں کیلیں اور ہاتھوں پر مہندی بھی لگی تھی۔ بعض صرف چولیاں اور لہنگے گھگرے پہنے ہوئے تھے۔ سب کے سب منہ سے ہائے ہائے کی آوازیں نکالتے، چھاتیاں پیٹتے، تالیاں بجاتے مٹک مٹک کر چل رہے تھے۔ جو ڈیل

کی جھنکار سے فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو رہا تھا۔ بعض کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے بینر لٹک رہے تھے۔ جن پر مختلف قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔

"ساری دُنیا کے ہیجڑے ایک ہیں۔"

"کل دُنیا ہیجڑوں کی ہوگی۔"

"ہم سے جو ٹکرائے گا ـــــ ہم جیسا ہو جائے گا۔"

"دیکھو دُنیا اوٹ پٹانگ ـــــ نیچے مُنڈی اوپر ٹانگ۔"

"ہماری مانگیں پوری کرو۔"

کسی نے پوچھا۔ "آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

"شاید یہ لوگ اپنی حکومت بنانا چاہتے ہیں۔"

"ارے یہ لوگ حکومت بنا کر کیا کریں گے۔"

"تالیاں بجائیں گے اور ہائے ہائے کریں گے۔"

"اور یہ ان کی کمروں میں کاٹھ کی تلواریں کس لئے ہیں؟"

"لڑنے کے لئے۔"

"اِن سے کون لڑے گا یار۔"

"سالے خود ہی سورما ن کر نکلے ہیں۔ واقعی ان سے کون لڑے گا؟"

"حکومت نے اِن لوگوں کو کافی چھوٹ دے رکھی ہے۔"

"میں کہتا ہوں حکومت میں بھی ان سالوں کے بہت سے نمائندے پہنچ چکے ہیں۔"

"بڑا بُرا زمانہ آگیا ہے یار، لوگ اپنی نامردی کو بھُنانے کا فن بھی جان گئے ہیں۔"

"کیا اس دیش میں اب انقلاب ان زنخوں کے توسط سے آئے گا؟"

اُدھر جلوس آگے سرکتا جا رہا تھا۔ اب جو گروپ گذر رہا تھا اُن میں شامل ہیجڑوں کی گردنوں میں بڑے بڑے ڈھول لٹک رہے تھے۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے اُنہیں پیٹتے یک خاص لے پر گاتے ہوئے چل رہے تھے۔ گیتوں میں سوائے گالیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

ڈھول بجاتے اور گالیاں بکتے وہ کبھی کبھی دونوں ہاتھ ہوا میں ہرا کر انگلیاں بھی چٹخانے لگتے۔

ان سب کی کمروں سے لٹکی ایک ایک عدد کاٹھ کی تلوار لٹکی ہوئی تھی بلکہ بعضوں کی پشتوں سے دفتی کی ڈھالیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ اتنے میں کہیں سے چند فوٹو گرافر نکل آئے۔ اور کھٹ کھٹ ان کی بیشمار تصویریں کھینچ لی گئیں۔ فوٹو گرافروں کو دیکھتے ہی ہر ہیجڑہ ایک خاص پوز میں کھڑا ہو گیا۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا کاٹھ کی تلوار کے دستے پر رکھ کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کسی ان دیکھے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے پینترے بدل رہا ہو۔ کوئی ناک پر انگلی رکھے دہانہ کھولے، بائے نوج کی تصویر بن گیا۔ کوئی دونوں ہاتھوں سے ڈھول پر تھاپ دینے کی اسٹائل میں کھڑا ہو گیا۔ کوئی کولہوں پہ ہاتھ رکھے مٹکنے لگا۔ ہیجڑوں کے مختلف پوز دیکھ دیکھ کر لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ اخبار کے چند رپورٹرز بھی کہیں سے آ دھمکے۔

"آپ لوگوں کے اس جلوس کا مقصد کیا ہے؟"

"کیا ضروری ہے کہ ہر کام کے پیچھے مقصد کا دُم چھلا بھی ہو۔"

"آپ لوگ لفٹسٹ ہیں یا رائٹسٹ؟"

"میاں راجہ میاں ——— ہم تو درمیانی لوگ ہیں۔"

سارے زنخے ہو ہو کر کے ہنسنے لگے۔

"آپ لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟"

ایک ہیجڑے نے کان پر ہاتھ رکھ کر الاپنا شروع کر دیا۔ "جو تیرا غم وہی غم ہے میرا....."

"آپ لوگوں کا نظریہ؟"

"نہ مارو بلوا تجریہ کے بان ——— تجریہ کے بان ———"

ایک ہیجڑا اپنی بائیں آنکھ دباتے ہوئے ایسے فحش انداز میں ہنسا کہ رپورٹر بغلیں جھانکنے لگا۔

"آپ لوگوں کا سیاسی بیک گراونڈ کیا ہے؟"

"ہمارا تو بس ایک ہی بیک گراونڈ ہے۔"

" ایک موٹے سے ہیجڑے نے اپنے بھاری کولہوں سے سوال پوچھنے والے رپورٹر کے ایسا ٹھمکا لگایا کہ بے چارا لڑکھڑا کر رہ گیا۔

آخر سارے رپورٹر تھک ہار کر ایک طرف کو ہٹ گئے اور جلوس پھر اسی طرح ہنستا ٹھمکتا آگے بڑھنے لگا۔ کسی طرح پولیس کو بھی اس عجیب و غریب جلوس کی خبر ہو گئی۔ سب سے پہلے تو ایک ٹریفک انسپکٹر

پنی موٹر سائیکل چھٹ پھٹاتا ہوا جلوس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ جلوس کے سامنے پہنچ کر اُس نے اپنی موٹر سائیکل کو ترچھا کر کے اُس ہیجڑے کا راستہ روک دیا جو سب سے آگے دوپٹے کا پرچم لہراتا ہوا چل رہا تھا۔
"ارے یہ کیا ہو رہا ہے ؟" انسپکٹر نے کڑک کر پوچھا۔
"جلوس جا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے" ہیجڑے نے ہاتھ نچاتے ہوئے جواب دیا۔
"مگر یہ جلوس کس کا ہے ؟ تم لوگ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہو ؟"
"ہمارا کسی پارٹی سے تعلق نہیں البتہ ہر پارٹی کو ہم سے سروکار ہوتا ہے۔ ہم بیچ کے لوگ ہیں۔"
"تم نے یہ جلوس کس کی اجازت سے نکالا ؟ تمہارے پاس اجازت نامہ ہے جلوس نکالنے کا ؟"
پرچم بردار ہیجڑے نے اپنے پاس ہی کھڑے ایک دوسرے ہیجڑے سے کہا۔ "ری رام کلی! دکھا دے اسے اپنا اجازت نامہ۔"
یہ سنتے ہی رام کلی نے اپنا چھتری نما پیٹی کوٹ، انسپکٹر کے سامنے کمر تک اُٹھا دیا۔ بے چارا انسپکٹر بوکھلا کر اس طرح پیچھے ہٹا کہ یکبارگی موٹر سائیکل سے گرتے گرتے بچا۔ سبھی ہیجڑے غل مچا کر ہنسنے اور تالیاں بجانے لگے۔ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تماش بین بھی بے تحاشا ہنس پڑے۔ انسپکٹر کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو گیا اُس نے پوری ہیجڑا برادری کو ایک موٹی سی گالی دی اور تیزی سے موٹر سائیکل موڑ کر ہوا ہو گیا۔ ہیجڑے اس کے پیچھے تالیاں بجاتے دیر تک ہائے ہائے کی آوازیں نکالتے رہے۔
اب جلوس شہر کی سب سے پُر رونق سڑک سے گذر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں فٹ پاتھوں پر تماش بینوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ بلکہ اُس جلوس کے متوازی سڑک کے دائیں بائیں فٹ پاتھوں پر ہزاروں تماش بین بھی جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اور جلوس میں شامل ہیجڑوں کی ایک ایک حرکت پر قہقہے لگا رہے تھے۔ سڑک پر رکی موٹروں سے ہارن پر ہارن دیئے جا رہے تھے مگر ہیجڑوں کا جلوس اپنی سی چال چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ آس پاس کے سینکڑوں ہزاروں لوگ ہیجڑوں کے نعروں کے جواب میں "ہاں جی ہاں جی" کی تکرار کرتے چل رہے تھے۔
جلوس چلتے چلتے شہر کے سب سے بڑے چوراہے پر آ گیا تھا۔ اتنے میں سائرن کی تیز سیٹیوں سے پورا علاقہ گونج گیا۔ چاروں طرف سے پولیس کی درجنوں گاڑیاں سائرن بجاتی آ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جلوس کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ مگر ہیجڑوں کے چہرے سے ذرا بھی تردد ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

سب نہایت اطمینان سے کھڑے پولیس والوں کی طرف دیکھ دیکھ کر تالیاں بجاتے ' ہائے ہائے کر رہے تھے۔

اتنے میں ایک پولیس وین سے اعلان ہوا ـــــ

"حکم دیا جاتا ہے کہ جلوس کے لیڈر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں اور دیگر لوگ یہاں سے چپ چاپ منتشر ہو جائیں۔ اس طرح بغیر اجازت سڑک پر جلوس نکالنا قانوناً جرم ہے۔"

مگر ہیجڑوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اسی طرح بک بک کرتے، ناچتے اور ہائے ہائے کرتے رہے۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے اسپیکر سے نعرہ لگایا۔

"جلوس کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے۔"

مگر ایس۔ پی کے حکم کے باوجود ہیجڑوں کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس کی گاڑی سے کوئی نہیں اُترا۔ ایس۔ پی نے ڈی۔ ایس۔ پی سے تیز لہجے میں پوچھا۔

"کیوں! یہ سپاہی انہیں گرفتار کیوں نہیں کر رہے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ ڈی۔ ایس۔ پی کوئی جواب دیتا ایک انسپکٹر دوڑتا ہوا سپرنٹنڈنٹ کی وین کے پاس آیا ـــ سیلوٹ دی اور ہانپتا ہوا بولا۔

"سر، کانسٹبل انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟" پولیس سپرنٹنڈنٹ کی بھویں تن گئیں۔

"سر! وہ کہتے ہیں ہم ہیجڑوں کو گرفتار نہیں کریں گے۔ اس کے لیے لیڈیز فورس کو بلایا جائے۔"

"وہاٹ نان سینس؟" پولیس سپرنٹنڈنٹ نے غرّا کر کہا۔

پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے بولا کہ وہ خود جا کر صحیح صورت حال کا پتہ چلائے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی وین سے اُتر کر پولیس والوں کی طرف گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد لوٹ کر آ گیا۔ اس کے چہرے سے بھی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"سر! اس معاملے میں ان پر دباؤ ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔ آخر ہمارے محکمے میں لیڈیز فورس بھی تو ہے۔"

سپرنٹنڈنٹ یکدم سے بھڑک گیا۔

"مگر ڈسپلین کی یہ سراسر خلاف ورزی ہے۔"

"ہے تو یہی، مگر جبر کرنے سے معاملہ بگڑ جائے گا سر!"

"پولس سپرنٹنڈنٹ چند لمحے جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر آپریٹر سے بولا۔" ڈی۔ سی۔ صاحب کو وائرلیس دو۔ اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرو۔"

آپریٹر نے ہیڈفون کانوں پر چڑھایا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے سپرنٹنڈنٹ کا پیغام دُہرا دیا۔ ڈپٹی کمشنر بھی چند لمحوں کے لئے مخمصے میں پڑ گئے۔ انہوں نے کمشنر سے رابطہ قائم کیا۔ کمشنر نے پوری روداد سُنی اور آخر میں لیڈیز فورس طلب کرنے کی اجازت دیدی۔ ہیڈکوارٹر بذریعہ وائرلیس اطلاع دیدی گئی۔ اور اب سب لیڈیز فورس کا انتظار کرنے لگے۔ اس ایچ ایس۔ پی نے بار بار اعلان کیا کہ "جلوس کے لیڈر اپنے آپ کو پولس کے حوالے کردیں"۔

غالباً اُدھر ہجڑے بھی صورتحال کی نزاکت کو اچھی طرح بھانپ گئے تھے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے۔

"ہم سے جو ٹکرائے گا۔۔ ہم جیسا ہو جائے گا۔"

"ایک جیسی تین ہیں ــــ راجہ بیٹھ جیل ہیں۔"

تمام ہجڑوں نے اپنی اپنی کمر میں بندھی کاٹھ کی تلواریں نکال لی تھیں۔ اور انہیں ہوا میں اُچھال اچھال کر گلا پھاڑ رہے تھے۔ ایک دُبلا پتلا ہجڑا تو ہوا میں تلوار چلاتا ہوا پینترے بھی بدل رہا تھا۔ مگر اس طرح لچک لچک کر جیسے کوئی نٹنی کسی تنی ہوئی رسی پر چلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دو ہجڑے کاٹھ کی تلواروں سے شمشیر زنی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے پر لہک لہک کر وار کرتے اور ہر وار پر ایک لذت آگیں سسکاری بھرتے۔ پولس کے سپاہی اب گاڑیوں سے اُتر آئے تھے۔ اور حیرت اور دلچسپی سے اس مضحکہ خیز منظر کو دیکھ رہے تھے۔ بلڈنگوں کی کھڑکیوں اور گیلریوں سے ہزاروں گردنیں لٹکی ہوئی تھیں۔

اتنے میں ایک بار پھر سائرن کی سیٹیوں سے فضا گونج اٹھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے مزید چار پولس وین آ پہنچیں۔ اور وین سے دھڑا دھڑ خاتون سپاہیوں کی پوری کھیپ برآمد ہوئی۔ مگر جب خاتون سپاہیوں کی نظر اُن ہیکلے مُشٹنڈے ہجڑوں پر پڑی تو ان کے بڑھتے ہوئے قدم یک بیک رُک گئے۔ اور اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے اور تمام لیڈیز پولس اُلٹے قدموں لوٹ کر دوبارہ گاڑیوں میں جا کر بیٹھ گئیں

انچارج لیڈی انسپکٹر نے ایس۔ پی سے کہا۔

"سر! لیڈیز ان ہجڑوں پر ہاتھ ڈالنے سے انکار کر رہی ہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ کہتی ہیں یہ کام ہمارا نہیں۔ ہم صرف عورتوں پر ہاتھ ڈال سکتی ہیں۔"

"مگر ــــ مگر ــــ عورتوں اور ہجڑوں میں کیا فرق ہے؟ میرا مطلب ہے ....."

سپرنٹنڈنٹ نے کہنے کو تو یہ جملہ کہہ دیا۔ مگر فوراً سے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

انچارج لیڈی انسپکٹر نے بُرا سا منہ بنایا اور بولی۔

"ایسا نہ کہیے سر! یوں دیکھا جائے تو مردوں اور ہجڑوں میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پھر مرد پولس نے اُنہیں گرفتار کرنے سے انکار کیوں کر دیا؟"

اتنا کہہ کر لیڈی انسپکٹر پیر پٹکتی اپنی وین میں جا کر بیٹھ گئی۔

اب تو پولس سپرنٹنڈنٹ بہت سٹپٹایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سچویشن کو کس طرح ہینڈل کرے۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے آپریٹر سے ہیڈ فون لے کر خود اپنے کانوں پر چڑھائے اور ڈپٹی کمشنر کو وائرلیس دیا۔ ڈپٹی کمشنر کو جب صحیح حالات کا علم ہوا تو وہ بھی گھبرا گیا۔ اُس نے فوراً کمشنر کو فون کیا۔ کمشنر نے بوکھلا کر ہوم سکریٹری سے رابطہ قائم کیا۔ ہوم سکریٹری نے ہوم منسٹر کو اطلاع دی۔ اور ہوم منسٹر نے حسب معمول اعلیٰ آفیسران کی میٹنگ طلب کرنے کا مشورہ دیدیا تاکہ لا اینڈ آرڈر کے مسئلے پر نئے سرے سے غور کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ بیچارے کر بھی کیا سکتے تھے کہ یہی ایک کام تھا جسے وہ بحسن و خوبی انجام دیتے آئے تھے۔ ویسے اُنہوں نے کمشنر کو دلاسا دے دیا کہ "ان بیچ کے لوگوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بے ضرر لوگ ہیں۔ اور جب تک بے ضرر ہیں اُن کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہ کی جائے۔"

کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کو فون کیا اور مذکورہ بالا پیغام لفظ بہ لفظ دُہرا دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے ایس۔ پی کو مطلع کیا۔ ایس۔ پی نے ہر پولس وین کے انچارج کو بلا کر وہی پیغام سناتے ہوئے کچھ ضروری ہدایات بھی ذہن نشین کرا دیں۔

اُدھر ہجڑے چیخ چیخ کر آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ اب وہ پولس کو دیکھ دیکھ کر ایسی ایسی فحش حرکتیں کرنے لگے کہ بیچارے پولس شرم سے سُرخ ہو گئیں۔ کھڑکیوں، گیلریوں اور مکانوں کے

چھجّوں سے جھانکنے والوں کو تو مفت کا تماشا ہاتھ آ گیا تھا۔ اب کھڑکیوں، دریچوں سے پھینکے ٹھکنے ہیجڑوں کی طرف سکّے اُچھالے جانے لگے تھے۔ ہیجڑوں کے نعرے، تماش بینوں کے قہقہے اور بلڈنگوں سے پھینکے جانیوالے سکّوں کی جھنا جھن سے ایسا شور مچا کہ پولس سپرنٹنڈنٹ نے جھنجھلا کر ایک ہوائی فائر کر دیا۔ ڈزن' کی آواز سے یک لخت پورا علاقہ گونج اُٹھا۔ ایک اونچی عمارت سے دو چار کبوتر پھڑپھڑا کر اُڑے اور چند لمحوں کے لیے چاروں طرف خاموشی سی چھا گئی۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ محض ہوائی فائر تھا تو ایکبار پھر سب شور مچانے لگے۔ ایک انسپکٹر نے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا کہ حکم ہو تو آنسو گیس کے شیلز داغے جائیں۔ مگر سپرنٹنڈنٹ نے سختی سے منع کر دیا کہ اعلیٰ حکام کی ہدایت کے مطابق "جب تک وہ بے ضرر ہیں ہماری طرف سے انہیں بھی کوئی ضرر نہ پہنچے "۔

اسی طرح جب ایس۔ پی نے لاٹھی چارج کی تجویز کو بھی ٹھکرا دیا تو پولس کے سپاہی اطمینان سے ایک طرف کو ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور تماشا کو جھانکتے ہوئے مونگ پھلیاں ٹھونگتے اور گیس رنگ تے لوگوں کے ساتھ خود بھی ہنسی قہقہے لگانے لگے۔

ٹھیک اُس وقت جبکہ ہیجڑوں کا لپکنا اور بلڈنگوں سے سکّوں کا اُچھال اور تماش بینوں کا قہقہہ لگانا شباب پر تھا۔ وہاں پولس کی ایک جیپ آ کر رُکی۔ ایک سب انسپکٹر جیپ سے اُتر کر دوڑتا ہوا پولس سپرنٹنڈنٹ کے پاس پہونچا اور آہستہ آہستہ اُس کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ یک بیک پولس سپرنٹنڈنٹ کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی۔ اُس نے بوکھلا کر اس چھوٹی سی گلی کی طرف دیکھا جو شاہراہ کی بائیں طرف۔ اونچی اونچی بلڈنگوں کے بیچ سے کسی تیز کٹار کی نوک کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی۔

"اوہو ــــ کیسے پتہ چلا کہ وہی ہیں؟"

"ابھی ابھی انٹیلیجنس برانچ سے اطلاع آئی ہے"۔

"اندازاً کتنے لوگ ہوں گے؟" سپرنٹنڈنٹ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"پندرہ بیس سے کم نہیں ہوں گے"۔

انسپکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"ہتھیاروں سے لیس ہیں یا نہتے ہیں؟"

"اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مگر ہمیں چوکس رہنا چاہیے"۔

"یقیناً ـــ یہ حرامزادے نہتے نہیں ہوتے۔ ہتھیار چھپا کر رکھتے ہیں۔ پچھلی دفعہ یاد نہیں ہے دھماکے میں ہمارے قریب درجن بھر سپاہی زخمی ہو گئے تھے۔"

"آپ نے صحیح فرمایا سر۔"

"مگر وہ لوگ اس گلی میں کیا کر رہے ہیں؟ کوئی خفیہ اجلاس؟"

"ہوسکتا ہے ـــ ویسے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اسی گلی کی کسی کھولی میں اُن کا ایک ہینڈ پریس لگا ہے۔ پچھلے ہفتہ حکومت کے خلاف جو ہینڈ بل اور پوسٹر چھپے تھے وہ اسی پریس میں چھاپے گئے تھے"۔

"ہوں، تب تو اُن میں سے ایک بھی بچ کر نہ جانے پائے۔ ہر ڈیوٹی انچارج کو جا کر خبردار کر دو۔"

"اور ان ہیجڑوں کا کیا کیا جائے سر"

"ارے ان کی فکر مت کرو۔ یہ تو صرف ہوائی فائر سے کائی کی طرح پھٹ جائیں گے۔ جلدی کرو کہیں شکار چوکنّا نہ ہو جائے"۔

انسپکٹر سیلوٹ دیکر تقریباً دوڑتا ہوا دوسرے پولیس والوں کو خبردار کرنے چلا گیا۔

اُدھر دوسروں نے بھی غالباً فضا میں بارود کی بو محسوس کر لی تھی۔ کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہیجڑوں کا ٹھمکنا اور نعرے لگانا ـــ بلڈنگوں سے پکّے اچھالنا اور پولس کا بار بار تنبیہ سے مطلع کرنا سب بند ہو گیا۔

ہٹّا ایس پی نے مائیکروفون پر چیخ کر کہا ـــ "ساؤنڈ ڈاؤن!"

بلڈنگوں کی کھڑکیوں، گیلریوں اور چھتوں سے جھانکتی گردنیں غائب ہو گئیں۔ عمارتوں کی کھلی کھڑکیاں کھٹ کھٹ بند ہونے لگیں۔ دکانوں کے شٹر گر گئے۔ اِدھر اُدھر کھڑی موٹریں، ٹیکسیاں، رکشے اور دوسری گاڑیاں سڑکوں سے سلیٹ پر بنی تصویروں کی طرح مٹ گئیں۔ فٹ پاتھیں اور سڑکیں ویران ہو گئیں۔ اور سب سے تعجب خیز بات یہ کہ وہ سارے ہیجڑے بھی ایک ایک دو دو کر کے محفوظ راستوں سے فرار ہو گئے۔

پولس کے سپاہی گاڑیوں سے کود کود کر گلی کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اور گلی کی سمت بندوقیں تانے مورچہ سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ اب چاروں طرف سنّاٹا چھا چکا تھا اور کہیں سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

یکایک اُس پتلی سی گلی سے ایک تیز رَو سنسناتا ہوا آیا اور پولس کی ایک جیپ گاڑی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ ایس۔ پی اپنی پوری طاقت سے چیخا۔

"فائر ـــ"

دَن، دَن بندوقوں کی گرج سے ساری فضا یوں دہل اٹھی جیسے کسی خوابیدہ شخص کو بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔

پرس رام نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ کُبڑا چھیدی رام اپنا خصّی کا سامان سمیٹ رہا تھا اور وہ میلا کچیلا چھکیا جو خصّی کرنے میں اُس کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا سامان سمیٹنے میں اُس کی مدد کر رہا تھا۔

پرس رام اُس کی نظریں بچا کر نکل جانا چاہتا تھا مگر اُس کے بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سے کُبڑا چھیدی رام اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور دور ہی سے اپنے غلیظ دانتوں کی مسوڑوں سمیت نمائش کرتا ہوا چلّایا۔

"پرسو دادا! میں کل پھر آؤں گا۔ آج رات بھر سوچ لو۔ اگر ارادہ ہو جائے تو سویرے بیلوں کو لے آنا۔ سب سے پہلے تمہارا ہی نمبر لگا دیں گے۔"

اور پھر بلا وجہ دیر تک ہی ہی کرتا رہا۔ پرس رام نے جلتی نگاہوں سے چھیدی رام کی طرف دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے خشک کھچڑی بال، سیاہ بھجنگ چہرہ، اندر کو دھنسی مچیاتی آنکھیں۔ گالوں کی اُبھری ہڈیاں، پستہ قد، میلی چیکٹ بنڈی غلیظ دھوتی، چھوٹے چھوٹے مگر غضب کے مضبوط درخت جیسے ہاتھ پاؤں۔ گلے میں ایک ڈوری سے بندھا کسی جنگلی جانور کا دانت، اور سب سے بڑھ کر اُس کی پیٹھ پر اُبھرا ہوا وہ بدہیئت کُبڑ —— پرس رام نے زندگی میں چھیدی سے زیادہ بدصورت آدمی دوسرا نہیں دیکھا تھا۔ تس پر جب وہ ہی ہی کر کے ہنستا اور اپنے غلیظ دانتوں کو مسوڑوں تک اُگھاڑ دیتا جو پان اور کتھے سے سیاہ پڑ چکے تھے تو بے انتہا نفرت انگیز لگتا۔ — نفرت انگیز، گھناؤنا اور خوفناک۔

پرس رام نے اپنے بیلوں کی رسوں کو مٹھی میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔

چھیدی ! میں نے تیرے کو سیرے ہی کہدیا تھا کہ مجھے اپنے بیلوں کی کھچی نہیں کرنی ہے۔ پھر تو بار بار کیوں پوچھتا ہے۔"

" دادا ! نارج ہونے کی بات نہیں۔ کھچی کرنا تو اپنا دھندا ہے۔ اس سے اپنی دال روٹی چلتی ہے۔ پوچھنا اپنا کام ہے۔ کرانا نہ کرانا تمھاری مرجی ہے۔ اور پھر اس بار تو تھارا دھیلا بھی کھرچ نہیں ہونے والا۔ سارا کھرچا گرام پنچایت دے رہی ہے ....'

" میرے کو سب مالوم ہے۔ پن میرے کو اپنے بیلوں کی کھچی نہیں کرنے کی ہے۔ پھوکٹ میں بھی نہیں۔"

" پن پرسو دادا ، میری سمجھ میں نہیں آتا تم اپنے جانور کی کھچی کرانے کو کیوں نا بولتے ہو۔ ارے تمھارے باپ دادا بھی تو اپنے جانوروں کی کھچی کراتے تھے۔ اور پھر دیکھو گاؤں والے سب رجی کھشی اپنے اپنے جانور کی کھچی کرا رہے ہیں۔"

" اگر گاؤں والے کرا رہے ہیں تو کیا جروری ہے کہ میں بھی کراؤں ! میں نے تم سے کہدیا نا کہ میرے پیچھے مت پڑو۔"

" پیچھے پڑنے کی بات نہیں۔ کھچی کرنا تو اپنا دھرم ہے۔ یہ پرمپرا تمھارے ہمارے بڑکھوں کے بیچ نہ جانے کب سے چل رہی ہے۔"

" میں نہیں مانتا ایسی ہلکٹ پرمپرا کو۔ یہ تو اپنے جانوروں کے پرتی اتیاچار ہے۔ گھور اتیاچار ......"

" نہیں نہیں دادا ! کھچی کرنا اتیاچار نہیں جانور پر اُپکار ہے۔ ارے اس سے جانور کی جندگانی بڑھ جاتی ہے۔" چھیدی نرم ہوا۔

پرس رام نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

مگر چھیدی ! نامردی کی جندگانی جینے سے تو مرجانا اچھا ہے۔"

" پراس کا لابھ بھی تو تم ہی کو ملے گا۔"

" پاپ بھی تو لگے گا۔"

"نا — نا — مجھے کرنے کو پاپ مت بولو —"

"میرے لیے یہ پاپ ہے۔ بہت بڑا پاپ اور دیکھو آگے سے تم مجھے مت ٹوکنا۔ ورنہ، اچھا نہیں ہوگا۔"

پرس رام اپنے بیلوں کو لیے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ چھیدی کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی — اور وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

اچھی بات ہے پرس رام! میں بھی دیکھوں گا کہ تم اپنے بیلوں کو کب تک بچاتے ہو۔"

مگر پرس رام نے نہ اُس کی زہریلی مسکراہٹ دیکھی۔ نہ اُس کی بڑبڑاہٹ سُنی۔ وہ اپنے بیلوں کو لیے آگے بڑھتا چلا گیا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ دور سے مندر کے گھنٹے کی مسلسل ٹن ٹن سُنائی دے رہی تھی۔ کسان اور مویشی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ بلکہ اکثر لوٹ چکے تھے۔ پچھواڑوں اور آنگنوں سے بیلوں کے ڈکرانے اور بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں تو گاؤں میں بجلی آ چکی تھی۔ سڑکوں پر لیمپ پوسٹ بھی لگ چکے تھے۔ مگر ابھی تک بتیاں نہیں جلی تھیں۔ بجلی اکثر دیر سے آتی — اور اگر آتی بھی تو ایک آدھ گھنٹے کے بعد فیل ہو جاتی اور پھر گھنٹوں نہیں آتی۔ اس لیے سبھی لوگ اپنی اپنی پرانی لالٹین اور ڈھبریوں میں تیل بھر کر تیار رکھتے اور سورج کے ڈوبتے ہی چراغ جلنے شروع ہو جاتے۔ گلیوں میں سایے گہرے ہونے لگے تھے۔ ادھر اُدھر اِکّا دُکّا چراغ بھی ٹمٹمانے لگے تھے۔ پرس رام اپنے بیلوں کی راسیں تھامے دو تین تنگ گلیاں مُڑنے کے بعد اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ وکرم اور روہنی گھر کے برانڈے میں بیٹھے کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز سُنتے ہی دونوں جھگڑا بھول کر بھاگتے ہوئے آئے اور پرس رام کے ہاتھ سے وکرم نے للو اور روہنی نے کالو کی رسیں لے لیں اور اُنھیں کھینچتے ہوئے گھر کے چوڑے آنگن میں ایک طرف گڑی مضبوط کھونٹیوں سے باندھنے لگے۔ پرس رام گھر کے سامنے بنے مٹی کے کچے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ سر سے لپٹے انگوچھے کو کھول کر ایک طرف ڈال دیا۔ پھر بنڈی کی جیب سے بیڑی اور ماچس نکالی۔ بیڑی کو دو انگلیوں سے اک ذرا سا مسل کر ہونٹوں میں دبایا۔ وہ جس کی تیلی انگلیوں میں دبائے تھوڑی دیر

تک اپنے بیلوں کو دیکھتا رہا جن کی گردنوں سے اُس کے دونوں بچے چمٹے جھول رہے تھے۔ پھر تیلی کو ماچس پر رگڑ کر بیڑی جلانی چاہی مگر تیلی بجھ گئی۔ اُس نے دوسری تیلی جلائی اور بیڑی سلگائی۔ دو تین گہرے کش لیے اور چلایا — "وکرم! روپنی! بیلوں کو تنگ مت کرو۔ جاؤ اُن کے لیے پانی لے آؤ —" وکرم اور روپنی بیلوں کی گردنیں چھوڑ کر بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔ پرس رام بیڑی کے کش لیتا ہوا کسی سوچ میں گم نیم وا آنکھوں سے بیلوں کو دیکھتا رہا۔ بیل کبھی دُم لہرا کر کبھی گردنیں ہلا کر مکھیوں کو بھگاتے رہے۔ وہ جب بھی گردن کو جھٹکا دے کر کسی مکھی یا مچھر کو اُڑانے کی کوشش کرتے گلے میں بندھی گھنٹی ٹن سے بج پڑتی۔

تھوڑی ہی دیر میں وکرم اور روپنی پانی کے ایک بڑے سے ٹب کو اُٹھائے ہوئے آ گئے۔ ٹب وزنی تھا۔ دونوں مُنہ سے آوازیں نکالتے۔ ہنستے کھلکھلاتے بڑی مشکل سے ٹب کو اُٹھا رہے تھے۔ ٹب کا پانی چھلک چھلک کر اُن کے کپڑے بھگو رہا تھا۔ دونوں نے ٹب بیلوں کے سامنے لے جا کر رکھ دیا۔ لالو اور کالو پانی پینے لگے۔

پرس رام نے بیڑی کا آخری کش لیا۔ بچی ہوئی بیڑی کو چبوترے کی دیوار پر رگڑ کر بجھا دیا اور ٹکڑے کو وہیں پھینک کر گھر کے سامنے بنے کوٹھے میں گیا۔ اندر کافی اندھیرا تھا۔ مگر وہ کوٹھا اُس کا اس قدر دیکھا بھالا تھا کہ اندھیرے میں بھی اُس میں رکھی ایک ایک چیز کو وہ اپنے جسم کے اعضاء کی طرح پہچان سکتا تھا۔

اندر سے اُس نے دو تھیلے اُٹھائے، بالٹی لی اور باہر نکل آیا۔ پھر گھر کے پچھواڑے پہنچا۔ پچھواڑے اناج کی کٹھولی کا دروازہ کھولا۔ وہاں اُس کی پتنی نے پہلے ہی ایک بڑی سی ہانڈی میں چنا گڑ اور کھلی بھگو کر رکھ دی تھی۔ اُس نے ہانڈی سے گڑ دانہ تھیلوں میں ڈالا اور دونوں تھیلے لا کر لالو اور کالو کے آگے رکھ دیے۔ لالو اور کالو نے اظہارِ مسرت کے طور پر اپنی گردنوں کو زور سے ہلایا، دُموں کو پھیرا اور تھیلوں میں مُنہ گھسا دیے۔ وکرم اور روپنی اب بیلوں کو چھوڑ کر آنگن میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ پرس رام دونوں بیلوں کی گردنوں کے کوہان پر ہاتھ رکھے اُنھیں شفقت سے دھیرے دھیرے سہلا رہا تھا۔ بیل بڑی رغبت سے بھوسا کھلی کھا رہے تھے۔ پرس رام تھوڑی دیر تک اُنھیں پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر جانے کب سا

ٹھنڈا سانس کھینچ کر دوبارہ چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ جیب سے بیڑی نکالی دانتوں میں دبائی اور
اُسے جلائے بغیر ہی خلاء میں گھورتا رہ گیا۔

"پرسیا!"

پرس رام روٹی کھا کر باہر نکل رہا تھا کہ باپو کی آواز آئی۔ وہ چونک کر مُڑا۔ اُس کا باپ
سامنے آم کے نیچے چارپائی پر بیٹھا چلم کھینچ رہا تھا۔

"کیا ہے باپو!" پرس رام باپ کے پاس چلا گیا۔

"آج چھیدی آیا تھا نا گاؤں میں ——؟"

"ہاں ——"

"تو پھر تو نے لالو کاکو کی کھچی کیوں نہیں کرائی ——؟"

"نہیں کرائی ——"

"پن کیوں؟"

"میرے کو اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا نہیں لگتا؟"

"ہاں ——"

"ارے مگر یہ تو پُرانی پرمپرا ہے۔ باپ دادا کے جمانے سے چلی آئی ہے۔ سب کراتے ہیں۔"

"کراتے ہوں گے۔ پن میرے کو اچھا نہیں لگتا۔"

"تو پھر بھیما بالکل ٹھیک کہتا تھا۔"

"کون بھیما؟ وہ گرام سیوک؟"

"ہاں ——"

"پن یہ بھیما کون ہوتا ہے میری چُگلی (چغلی) کھانے والا۔ اُس کو اتنی پنچایت کیوں؟"

"ارے وہ گرام پنچایت کا آدمی ہے۔ اُس کو پنچایت نہیں ہوگی تو کس کو ہوگی۔"

"پن گرام پنچایت کو میرے بیلوں کی کھچی سے کیا لینا دینا۔"

"تیرے کو نہیں معلوم اس سال گرام پنچایت نے ہی چھیدی رام کو خصّی کرنے کا کنٹرک دیا ہے۔"

"پت باپو۔ کیا ہر بیل کی خصّی کرنا جروری ہے؟"

"بالکل جروری ہے۔ خصّی نہیں کریں گے تو بیل مجبور ہو جائے گا۔ گائے کو دیکھ دیکھ کے بھڑکے گا اور ایک دن جھرجھر کے مر جائے گا۔ دیکھ پرسو! ہم گریب لوگ ہیں۔ گھڑی گھڑی بیل خریدنے کی ہماری ہستی نہیں۔ خصّی کرنے سے بیل اپنی ساری شکتی کام میں لگاتا ہے۔ وہ جتنا کام کرے گا ہمارا اُتنا پھائدہ ہے — ہے کہ نہیں؟ —"

"بات تو تمھاری ٹھیک ہے باپو" پرس رام نے سر کھجاتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"مگر میرا جی نہیں مانتا۔ سوچو باپو! ہم اپنے پھائدے کے لیے بیل سے اُس کی جندگانی کا کتنا بڑا سکھ چھین لیتے ہیں۔"

"ارے کچھ نہیں چھینتے — کیا ہم اُسے کھانے کو نہیں دیتے۔ بس کر اور کیا چاہیے۔"

"رام — رام گوپی کاکا!" بھیما پاٹل باڑے میں داخل ہوتا ہوا بولا — "رام — رام پرسو دادا۔"

"رام — رام — ارے آؤ بھیما — میں ابھی تمھاری ہی یاد نکال رہا تھا — آؤ بیٹھو —"

پرس رام کے باپ نے بھیما پاٹل کو اپنے پاس بٹھایا۔

"کیا کھانا پینا ہوگیا —؟"

"ہاں — لو چلم کھینچو —"

"نہیں کاکا — تمھاری چلم بہت کڑک ہوتی ہے۔ بیڑی ہو تو دو۔ پی لوں گا۔"

"ارے پرسو! پاٹل کو بیڑی دے۔"

پرس رام نے جیب سے بیڑی اور ماچس نکالی اور بھیما کو دے دی۔ بھیما نے بیڑی منہ میں دبائی اور تیلی کو ماچس پر رگڑ کر اپنی بیڑی جلائی۔ پھر جلتی تیلی کو چٹکی میں پکڑ کر پرس رام کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نہیں پیو گے —"

"نہیں ــــ" پرس رام نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" اچھا ــــ اچھا ــــ کاکا کے سامنے نہیں پیتے ۔" گوپی نے چلم کا کش کھینچتے ہوئے کہا ۔

" بھیا میرا پرسو بہت سیدھا ہے ۔ وہ اپنے بڑوں کے سامنے بیڑی نہیں پیتا ۔"

" اچھا ہے ــــ اچھا ہے " ــــ بھیا نے بیڑی کا دھواں حلق سے خارج کرتے ہوئے کہا ۔

" بڑوں کا آدر کرنا چاہیے ۔ یہی ہمارا دھرم ہے ۔ یہی ہمارے سنسکار ہیں ۔"

" پاٹل میں نے پرسو کو سمجھا دیا ہے ۔ کل وہ لالو کالو کو لے کر چھیدی کے پاس چلا جائے گا ۔
پیسے ویسے تو نہیں دینے پڑیں گے نا ــــ ؟"

" ارے نہیں کاکا ! چھیدی کو تو گرام پنچایت پیسہ دے گی ۔ پھر وہ پرس رام سے مخاطب ہو ۔
ــــ پرسو دادا ! بیلوں کی بچّی کروانے کے بعد اپنا نام گرام پنچایت کی آفس میں آکر لکھوا دینا ۔
پنچایت بیلوں کو تین دن کے چارے پانی کا پیسہ بھی دے گی ۔ تین دن تک بیل کھیت پر
نہیں جائیں گے ــــ"

" پن پاٹل ! میں اپنے بیلوں کی بچّی نہیں کروانا چاہتا ۔"

پرس رام نے پھر ہاتھ پاؤں مارے ۔

" مگر ابھی تو کاکا بولتے تھے ــــ "

" پرسو ! یہ کیا پاگل پن ہے ــــ ساری بستی اپنے جناوروں کی بچّی کروا رہی ہے ۔ اور
تم اپنی وہی مُرگے کی ایک ٹانگ لے کر بیٹھے ہو ــــ "

" پرسو بیٹا ! بے کار کی ضد چھوڑ دو ــــ کل صُبح اپنے جانور لے کر چوپال پر آجانا ۔ بچّی تو
تم کو کرانی پڑے گی ۔"

" جبر دستی ــــ "

نہیں زبردستی تو نہیں ــــ مگر سرکار کا آرڈر ہے ۔ جو لوگ اپنے جانور کی بچّی نہیں کرائیں گے
اُن کا نام اوپر بھیجنے کا حکم ہے ــــ"

" اوپر کدھر ؟"

" اوپر یعنی اوپر ــــ یہ سرکاری راز ہے ۔ سب کو نہیں بتا سکتے ۔"

"پرسیا! کیوں بے کار میں بکھیڑ کرتا ہے۔ جو سب کرتے ہیں وہ تو بھی کر ــــ اور چپ چاپ کل جانور لے کر چلے جا چکیدی کے پاس ــــ"

"اچھا کاکا! میں چلتا ہوں۔ ادر بھی جگہ جانا ہے۔ مجھ کو ــــ"

بھیما پاٹل اپنی بیڑی پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے بیٹھو پاٹل! چائے تو پی کر جاؤ ــــ گھر والی پرسی کی چائے بن جاتی ہے۔ بھولاتی ہی ہوگی۔"

"نہیں کاکا! پھر کبھی پی لوں گا۔ آج کام ہے۔"

"کیا ناراج ہو گئے؟" گوپی بولا۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔" پاٹل نے ٹالنا چاہا۔

"دیکھو پاٹل۔" گوپی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پرسیا ابھی جوان ہے۔ خون میں گرمی ہے۔ تم چنتا مت کرو۔ میں اُسے راجی کر لوں گا۔"

"مجھے کیوں چنتا ہونے لگی۔ یہ میرے گھر کا کام تو ہے نہیں۔ جو سرکاری حکم نہیں مانے گا۔ وہ بھگتے گا۔"

"اب چلوں ــــ" بھیما چلنے لگا۔

"اچھا پاٹل! ایک بات تو بتاتے جاؤ ــــ"

پرس رام بولا۔ بھیما چلتے چلتے رُک گیا۔

"کیسی بات؟"

"اگر بستی کے سارے بیل کھچی ہو گئے تو ہمارے جانوروں کی اگلی نسل کا کیا ہوگا۔ پھر تو کوئی بھی گائے گابھن نہیں ہو سکتی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو ــــ تم کیا سرکار کو اتنا مورکھ سمجھتے ہو کہ اُسے تمہاری گایوں کی چنتا ہی نہیں ــــ تمہارے جانوروں کی اگلی نسل کا انتظام بھی سرکار کرے گی۔"

"سرکار کرے گی؟"

پرس رام نے حیرت سے بھیما پاٹل کو دیکھا پھر اپنے باپ گوپی کی طرف دیکھنے لگا۔ گوپی

بھی بھیما پاٹل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں کے بھاؤ سے لگ رہا تھا وہ بھی اس جواب پر کچھ سٹ پٹا سا گیا ہے۔ مگر بھیما پاٹل نہایت اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں — سرکار کرے گی، سرکار کے پاس ایسے پاستو ز بنشو موجود ہیں جو صرف ایک ہی باری میں ساری ماداؤں کو گابھن کردیں گے۔"

گوپی اور پرس رام دونوں یوں چپ ہو گئے جیسے اچانک پتھر کے ہو گئے ہوں۔

"ور کچھ پوچھنا ہے؟" پاٹل نے پرس رام سے پوچھا۔

پرس رام تو چپ ہی رہا مگر گوپی بے خیالی میں نفی میں گردن ہلانے لگا۔

دونوں باپ بیٹے جانے کتنی دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ پاٹل لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُن کے باڑے سے کب کا جا چکا تھا۔ آخر دونوں دنچا کی آواز پر چونکے۔ پرس رام کی پتنی دنچا چائے کے پیالے لیے کھڑی تھی۔

"بابا! چائے لو —"

"آں — ہاں — دے — مگر پاٹل تو چلا گیا۔"

گوپی نے بہو کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی۔

دنچا نے دوسری پیالی پرس رام کی طرف بڑھائی۔ "تم پی لو۔"

مگر پرس رام چائے کی پیالی پینے کی بجائے مُڑ کر تیز تیز چلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ دنچا پیالی ہاتھ میں لیے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ اُسے بُرا بھی لگا مگر وہ دوسرے ہاتھ سے اپنا پلّو سنوارنے لگی۔

"آج اس کا سر پھر گیا ہے۔" گوپی خود ہی بڑبڑانے لگا۔

"کیا ہوا؟ پاٹل سے کچھ کہا سنی ہو گئی کیا؟"

"نہیں — کچھ نہیں — تو جا۔"

دنچا پیالی لیے واپس مُڑ گئی — گوپی چائے سُڑکنے لگا۔

پرس رام اپنی چارپائی پر چت لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ دنچا پانی کا لوٹا لے کر اندر آئی تب بھی وہ چھت پر آنکھیں گڑائے بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ دنچا نے پانی کا لوٹا ایک

کونے میں رکھ دیا۔ پٹ کر گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ واپس آکر دیوار میں لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینے کے ایک کونے میں پرس رام لیٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ونجا نے آئینے میں ایک نگاہ اُس پر ڈالی مگر وہ اسی طرح چپ چاپ لیٹا رہا۔ ونجی نے بھی اُس سے کچھ نہیں پوچھا وہ بھی خفا تھی۔ آخر اُس نے بابا کے سامنے اُس کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ کیوں نہیں لیا۔ بنا کچھ کہے ایسے چلا گیا جیسے وہ اُس کی پتنی نہیں ہو، کوئی ہو ـــــ اونہہ ـــــ ونجا نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور اپنے بالوں کا جوڑا کھول دیا۔ اُس کی پیٹھ پر کالے پانی کا آبشار سا گرا۔ وہ پرس رام کی ساری کمزوریاں جانتی تھی۔ اُسے راہ پر لانے کا یہ پہلا اُپائے تھا۔ وہ اُس کے کالے گھنے بالوں کا ایسا دیوانہ تھا کہ کھلے بال دیکھتے ہی مست بیل کی طرح اُس کے نتھنے پھڑکنے لگتے تھے۔ مگر اُس نے آئینے کے کونے سے جھانکا تو وہ اب بھی اُسی طرح پڑا ہوا تھا۔

کیا ہو گیا ہے اِسے آج ـــــ کوئی گمبھیر بات لگتی ہے۔ ونجا نے دل میں سوچا ـــــ اُس نے اپنا کاشٹا کھولا اور اپنی نوگز کی ساڑی اُتارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ کنکھیوں سے پرس رام کو نہارتی بھی جا رہی تھی۔ پوری ساڑی کھل گئی ـــــ آخری گھیر باقی تھا، اُس کی کمر کے قوسین ٹھاٹیں مارنے لگے اور رانوں میں بجلیاں تڑپنے لگیں۔ مگر پرس رام کی نگاہیں اُسی طرح چھت پر ٹنگی رہیں۔ ونجی نے ساڑی اُتار کر رسی پر ڈال دی اور وہیں سے ایک مہین سی ہشوق اُٹھا کر پہن لی اور چارپائی پر پرس رام کی پائینتی آکر بیٹھ گئی۔ پرس رام ایسے چونکا جیسے اب تک اُس کے وجود سے بالکل ہی بے خبر رہا ہو۔

"کیا بات ہے؟ کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟"

پرس رام کی اس غیر معمولی چپّی نے آخر ونجا کو بولنے پر مجبور کر دیا۔

آں ـــــ نہیں ـــــ کوئی جھگڑا وگڑا نہیں ـــــ

"پھر اتنے چپ چپ کیوں ہو ـــــ باڑے میں بھی میں نے چائے کا پیالہ دیا تو پیالہ لینے کے بدلے بنا بولے اندر آ گئے۔"

"چائے کا پیالہ ـــــ اوہو ـــــ ارے میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔"

"اور اب بھی کہاں دھیان دے رہے ہو۔"

ونجا نے خواہ مخواہ اپنے سینے پر پڑی بالوں کی لٹ کو پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ سینے کے دباؤ سے اُس کی تنگ چولی پھٹی جا رہی تھی۔

"آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

پرس رام اُس کے سینے کے کساؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

"میں بھی نہیں؟" ونجا چارپائی پر اوپر کی طرف کھسک کر اُس کے سینے پر جھک گئی۔ چارپائی اک ذرا سی چرمرائی۔

"نہیں یہ بات نہیں ۔۔۔" پرس رام دھیرے سے مسکرایا۔ پھر اُس نے ونجا کو کھینچ کر اپنی بانہوں میں کس لیا۔ ونجا اُس کی بانہوں سے نکلنے کے لیے جھوٹ موٹ کسمسائی۔

"نہیں پہلے یہ بتاؤ کہ آج اتنے گمبھیر کیوں ہو؟"

"ارے کوئی خاص بات نہیں ۔۔۔ بابو لالو اور کالو کی کھچی کرانے کو کہتے ہیں ۔۔۔ میں منع کر رہا ہوں۔"

"پاٹل کیوں آیا تھا۔"

"وہ بھی یہی کہنے کو آیا تھا کہ کھچی کروا لو۔"

"تو پھر کروا لونا۔"

"نہیں ونجا تو نہیں سمجھتی یہ ظلم ہے ۔۔۔ بے زبان جانوروں پر اتیاچار ہے۔"

"مگر سب تو کرواتے ہیں۔"

"ہاں یہی تو بات ہے۔ جب کوئی کچھ نہ بولے تو دھیرے دھیرے سب کو ظلم سہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔"

"اگر کھچی نہیں کرائیں گے تو کیا ہوگا؟"

"پاٹل کہتا ہے۔ میرا نام اوپر سرکار کے پاس بھیج دیا جائے گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا ۔۔۔ سرکار نظر میں رکھے گی ۔۔۔ دانہ کھاد کی جو سہولت ہے وہ بند ہو سکتی ہے۔ ۔۔۔ اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

'تو پھر جانے دو نا ۔۔۔ تم کیوں کیچڑ میں پڑتے ہو ۔۔۔ کھچی کرانے سے تمھارا کیا بگڑتا ہے'۔

"ونجا تم بھی ایسی کہتی ہو ۔۔۔ ارے جانور بے جبان بھلے ہوتے ہیں بے جان نہیں ہوتے۔ اُن کی بھی بھاؤ نائیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی دُکھ سُکھ انوبھو کرتے ہیں۔ وہ بھی سنتے روتے ہیں۔ مگر ہمیں دکھائی نہیں دیتا یا شاید ہم اُن کے دُکھ سُکھ کو سمجھ نہیں پاتے۔ ہم جانور کی کھچی کراتے ہیں۔ ذرا سوچو کل کوئی ہماری کھچی کرنا چاہے تو ہم کرائیں گے؟

بولو! کل پنچایت میری کھچی کرنے کا حکم دے تو تم مان جاؤ گی؟"

'چھی ۔۔۔' ونجا ہنستی ہوئی دوہری ہو کر بولی "کیسی بات کرتے ہو ۔۔۔"

"نہیں میں سچ پوچھتا ہوں۔ بولو! کوئی میری کھچی کرنا چاہے تو تم مان جاؤ گی"

"چپ کرو ۔۔۔ کیا اَسگون بکتے ہو ۔۔۔" ونجا نے لپک کر پرس رام کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جانور اور انسان میں پھرک ہوتا ہے۔ اور پھر بیلوں کی کھچی ہی تو کرا رہے ہیں کسائی کھانے تو نہیں بھیج رہے ہیں۔ ہم گریب لوگ ہیں۔ بال بچے دار ہیں۔ سرکار کا حکم نہیں مانیں گے تو پریشانی میں پڑ جائیں گے۔ پھر تم اکیلے کر بھی کیا سکتے ہو۔ جیسا سب کرتے ہیں تم بھی کرو۔ تم پنچایت سے باہر تو نہیں ہو ۔۔۔"

پرس رام خالی خالی نظروں سے ونجا کو دیکھتا رہا۔ ونجا نے مسکرا کر لگاوٹ سے اُسے دیکھا اور اُس کی ناک پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی۔

"چلو اب سو جاؤ رات جادہ ہو گئی ہے۔ سویرے اُٹھنا ہے۔ بتّی بجھا دوں ۔۔۔؟"

پرس رام اب بھی چپ تھا۔ ونجا نے اُٹھ کر بتّی بجھ دی اور پھر آ کر پرس رام کی بغل میں سِمٹ گئی۔

سویرے پرس رام تیار ہو کر سولہ کالو کی رسیں تھامے چوپال پہنچ گیا۔ کبڑا چھیدی رام جھکیا کے ساتھ وہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ پرس رام پر نظر پڑتے ہی چھیدی ہنک کر بولا۔

"آؤ پرسو دادا آؤ ۔۔۔ میں تمھاری ہی باٹ دیکھ رہا تھا۔ آہا کیا جوڑی ہے۔ سچی پرسو دادا۔ ایسی کھلاڑی جوڑی آس پاس سو کوس تک نہیں ہو گی"

پھر جھکیا کی طرف مُڑا۔ "چل رے جھکیا! سامان نکال"

بھکیا ترنت جھولے میں سے سامان نکالنے لگا۔ مضبوط رسّی کے دو لچھے، لکڑی کا بڑا سا کندہ، لکڑی کی ہتھوڑی۔ اور ایک بڑا سا چمٹا۔ چھیدی رام نے آگے بڑھ کر پرس رام کے ہاتھ سے پہلے لالو کی راس لے لی اور ایک طرف کو مڑ گیا۔ پرس رام کو لگا جیسے کسی نے اُس کے کلیجے کو مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

بھکیا نے ترنت پھندا لگا کر لالو کو زمین پر گرا دیا اور اس کی دونوں سینگیں تھام، گردن دبوچ کر بیٹھ گیا۔ چھیدی نے جھٹ پٹ لالو کے چاروں پیر کس کر باندھ دیئے۔ پھر لکڑی کے کندے پر لالو کے خصیوں کو جما کر رکھا۔ چمٹے سے خصیوں کو جڑوں کے پاس سے پکڑ کر دھیرے دھیرے اُنھیں اس طرح دبایا کہ لالو کی دونوں آنکھیں سیتاپھل کے بیجوں کی طرح نکل آئیں۔ پھر لکڑی کی ہتھوڑی سے خصیے پر پہلی ضرب لگائی۔ لالو زلزلے کی زد میں آئی کسی عمارت کی طرح کانپا۔

جب بعض لوگوں کو پتہ چلا کہ پرس رام بھی اپنے بیلوں کی خصّی کرانے آیا ہے تو آس پاس کے گھر والے یوں ہی تماشا دیکھنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ بیشتر کے چہروں سے ایک کمینی قسم کی آسودگی بھی جھلک رہی تھی۔ چھیدی رام اطراف کے ماحول سے بے نیاز نہایت سکوت اور اطمینان سے بیل کے خصیوں پر لکڑی کی ہتھوڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگاتا رہا۔ اور ہر ضرب پر بیل اس طرح جھرجھری لیتا جیسے اسے بجلی کا ننگا تار چھوایا جا رہا ہو۔ بیل کے خصیوں کا رنگ پہلے گلابی، گلابی سے سُرخ ہوا۔ اُس کے بعد دھیرے دھیرے نیلا پڑتا گیا۔ چھیدی رام کی ضربیں ایک تواتر کے ساتھ جاری تھیں مگر اب لالو کی جھرجھریوں میں بتدریج کمی ہوتی چلی گئی۔ آخر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ ہتھوڑی کی چوٹ کے باوجود لالو نے کوئی جھرجھری نہیں لی۔ تب چھیدی رام رسّی کی گرہیں کھولتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور جیسے تو زمین پر اُلٹے پڑے تل چٹے کی طرح جھٹ پٹایا۔ پھر ایک بارگی چاروں پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ کُبڑے چھیدی رام نے لالو کی راس پرس رام کے حوالے کر دی۔

پرس رام ایک سکتے کے سے عالم میں کھڑا تھا۔ پھر بھکیا نے کالو کو بھی اُسی طرح پھندا لگا کر گرا دیا اور چھیدی نے لالو ہی کی طرح کالو کی بھی خصّی کر دی۔

"پرسو دادا!" کُبڑے چھیدی کی کھرکھری آواز نے پرس رام کو چونکا دیا۔

"آں ـــــ"

پرنس رام نے خالی خالی نظروں سے چھیدی کی طرف دیکھا۔

"اب تم اپنے پیسوں کو لے جا سکتے ہو۔ چھیدی کی یہ آواز سنتے ہی اُس کے کانوں میں سن سنی کی طرح گھومنے لگی ـــــ

پرنس رام کچھ نہیں بولا۔ دونوں پیسوں کی راسیں تھامے اپنے گھر کی طرف اس طرح چلا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔

لوگوں نے دیکھا کہ دونوں گھوڑے تو ٹھیک چل رہے تھے۔ مگر پرنس رام بُری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ ●●

ایک اور شرون کمار

راجہ دشرتھ کے ہاتھوں شرون کمار کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دیش بھر میں پھیل گئی۔ لوگ شرون کمار کی سعادت مندی خدمت گزاری اور فرماں برداری پر عش عش کر اُٹھے اور اُس کی جواں مرگی کو یاد کر کر کے افسوس کرنے لگے۔ راجہ دشرتھ کو بھی بڑا پچھتاوا ہوا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ شرون کمار مر گیا، مگر اُس کا نام اتہاس میں امر ہو گیا۔ اتفاق سے اُنہیں دنوں پاس کی ایک بستی میں ایک شرون کمار رہتا تھا۔ اُس کے ماتا پتا بھی ضعیف درانداز تھے لیکن ضعیفی نے اُن کی بینائی کو متاثر کر دیا تھا۔ البتہ اُس کے ماتا پتا نے بہت پہلے اُس کی شادی کر دی تھی اور اب وہ ایک عدد بیوی کا شوہر اور چار عدد بچوں کا باپ تھا۔ اُس کی ایک بیوہ بہن بھی تھی جو اپنے شوہر کے نا وقت انتقال کے بعد سسرال والوں کے ظلم سے تنگ آکر اپنے بچوں کے ساتھ اُس کے گھر آ ٹکی تھی۔ وہ ایک ذمّہ دار فرد کی طرح اُن سب کی کفالت کر رہا تھا۔ اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ حتی الامکان اُن سب کو خوش اور سُکھی رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کوشش میں اُس کے سر کے بال اُڑ گئے تھے۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ گرہستی کی گاڑی کھینچتے کھینچتے اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی، مگر وہ اپنی پیشانی پر بل نہ آنے دیتا۔ ذمّہ داریوں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے اُس کے کاندھے جھک گئے تھے، مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا۔ اُسے بھیتر سے گھن لگ گیا تھا۔ مگر وہ باہر سے ہمیشہ چاق و چوبند دکھائی دینے کی کوشش کرتا۔ مبادا لوگ اُسے اکل کھرا، ناخلف اور غیر ذمّہ دار، نہ کہیں۔

ہوتے ہوتے پہلے شرون کمار کی موت کی خبر اُس ابستی میں بھی پہنچی۔ لوگوں نے سورگیہ شرون کمار کی موت کا بہت دُکھ مانا۔ جگہ جگہ اُس کی موت کا چرچا کرنے لگے۔ لوگ بڑی رقت سے اُس کی بے مثال قربانی کا ذکر کرتے اور بعض جذباتی لوگ اُس کی یاد میں دو چار آنسو بھی ٹپکا دیتے۔ اُس کے گھر میں بھی اُس کے بوڑھے ماتا پتا، اُس کی پتنی اور بیوہ بہن دُکھی ہو ہو کر صبح شام سورگیہ شرون کمار کا ذکر چھیڑ دیتے۔

"آہ کیا بیٹا تھا۔"

"اُسے اپنے بوڑھے ماتا پتا سے کتنی محبت تھی اُن کی ذرا سی خواہش کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔"

بیٹا ہو تو ایسا ہو۔"

"ایشور سب کو ایسی ہی سنتان دے۔"

ماں باپ کے ساتھ اس کی بیوی اور بہن بھی مرنے والے کی تعریفیں کرتی رہتیں۔

"بڑا ویر پُرش تھا۔"

"ذمہ داری نبھاتے نبھاتے اپنے پران تیاگ دیئے۔"

"کرتویہ کا پالن اسی کو کہتے ہیں۔"

"اب اُس جیسا کوئی پُرش پیدا نہیں ہو سکتا۔"

شروع شروع میں تو دوسرا شرون کمار یہ سب باتیں سُنتا رہا بلکہ کبھی کبھی وہ خود بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ مگر دھیرے دھیرے اُس نے محسوس کیا کہ بات صرف مرنے والے کی تعریف کی نہیں ہے۔ اُس تعریف کے پردے میں اُس کے ماتا پتا پتنی اور بہن اُس سے کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔ وہ روز نہ مرنے والے کو شردھا سے یاد کر کے اُس پر شبدوں کی پھول مالائیں چڑھاتے ہیں۔ مگر اُن پھولوں کے اندر چھپے ہوئے کانٹے وہ محسوس کر سکتا تھا۔ اب اُسے مرنے والے کے ذکر سے چڑ سی ہونے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے گھر والوں کی گفتگو کے پیچھے چھپے ہوئے طنز کی رہنمائی کو سمجھنے لگا۔ وہ سمجھنے لگا کہ دراصل یہ لوگ سورگیہ شرون کمار کی تعریف نہیں کر رہے ہیں بلکہ اُس کی مجبوریوں اور لاچاریوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ وہ جتا رہے ہیں کہ وہ نہایت نکما، نکھٹو اور ناکارہ ہے۔ وہ اُسے اُس کی بے بسی کا احساس دلا رہے ہیں۔ پہلے کی تعریف میں دوسرے کے عیب نکال رہے ہیں۔

آخر کیا چاہتے ہیں یہ لوگ، ٹھیک ہے اُس ترون کمار نے اپنے کرتویہ کا پالن کرتے ہوئے سب پر پران نچھاور کر دیے۔ مگر وہ خود کبھی تو اُن سب کے لیے بیس دفعہ جیتا اور بیس دفعہ مرتا ہے۔ اُن سب کی ضرورتیں پوری کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے۔ اُنھیں زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے۔ لوگوں کی گھڑکیاں سہتا ہے، گالیاں سنتا ہے، ذلتیں اُٹھاتا ہے۔ اتنا سب کرنے کے بعد بھی یہ طنز میں ڈوبی باتیں کیوں؟ یہ طعنے تشنے کس لیے؟

آخر ایک دن وہ پھٹ پڑا۔

"کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟ آں ــــ بتائیے کیا چاہیے آپ کو؟ آپ لوگ کیا مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں؟ آپ لوگوں کی خاطر میں صبح سے شام تک چکر گھنی کی طرح گھومتا رہتا ہوں۔ محنت کرتے کرتے میرے ہاتھوں میں گٹھے پڑ گئے ہیں۔ چلتے چلتے تلوے زخمی ہو گئے ہیں۔ میرا سارا خون پسینہ بن کر بہہ چکا ہے۔ میں نے اپنی ایک ایک سانس کو آپ لوگوں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ پھر بھی آپ لوگ ناخوش ہیں۔ آپ لوگوں کی دبی دبی چٹکیاں، چھپے چھپے نشتر اب مجھ سے سہے نہیں جاتے۔ طنز کے تیروں سے میری آتما چھلنی ہو گئی ہے۔ میرے روئیں روئیں میں سوئیاں گڑی ہیں۔ میں اندر سے اس قدر کھوکھلا ہو گیا ہوں کہ اگر کوئی مجھے انگلی سے صرف چھو دے تو میں بھربھرا کر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ اب میرے دھیرج کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ میری اس سے زیادہ پریکشا مت لیجیے۔ میں آپ لوگوں کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ مجھے بتائیے۔ کھل کر بتائیے کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ میں جو دے سکتا تھا، دے رہا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ابھی میرے پاس میرے پران باقی ہیں۔ جو میں نے آپ لوگوں پر نچھاور نہیں کیے۔ مگر کیا آپ لوگ نہیں جانتے کہ وہ آپ ہی لوگوں پر خرچ ہو رہے ہیں۔ قسط وار خرچ ہو رہے ہیں۔ میں اپنی زندگی کو آپ کا قرض مانتا ہوں اور اسے سود در سود ادا کر رہا ہوں۔"

بولتے بولتے اُس کا سانس پھول گیا۔ اُسے لگا اگر وہ اب ایک شبد بھی بولا تو اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ وہ ایک دم سے چپ ہو گیا۔ ماتا پتا بیوی بہن سب اُسے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ نفرت اور غصے سے اُن کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اُسے لگا وہ ایک ایسے کمرے میں بند ہو گیا ہے، جسے چاروں طرف سے شعلوں نے گھیر لیا ہے۔

"بولو ــــ بولتے کیوں نہیں؟"

وہ گھبرا کر چیخی ــــ شبدوں کی زبانیں اس کی روح کو چاٹنے لگی تھیں۔ تب بوڑھے باپ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ بلغم کا بڑا سا لوندا اُگال دان میں تھوکا اور بولا۔

"تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ راجہ ہریش چندر؟ دو روٹیاں اور ایک دھوتی دے کر سمجھتے ہو کہ تم نے ہمیں سنسار کے سارے سکھ دے دیے۔ تم اگر ہماری سیوا کرتے ہو تو ہم پر اپکار نہیں کرتے۔ یہ تو تمہارا دھرم ہے۔ میں نے تمہیں پچیس برس تک پالا پوسا، تمہارے لیے کڑی سے کڑی محنت کی، تمہیں اچھے سے اچھا کھلایا پلایا، تمہیں کڑیل جوان بنایا۔ تمہارا بیاہ کیا۔ مگر کبھی تم سے کچھ نہیں چاہا اور اب جب کہ تمہارے لیے مرتے کھٹتے میری بوڑھی ہڈیاں گل چکی ہیں۔ تم مجھے کوڑا سمجھ کر ایک کونے میں ڈال دینا چاہتے ہو۔ میرے ایک ایک نوالے، ایک ایک گھونٹ کا حساب مانگ رہے ہو۔ ارے تمہارے لیے میں نے جتنا کیا ہے اگر ایک کتے کے پلے کے لیے بھی کرتا تو وہ زندگی بھر میرے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا رہتا۔ تم کہتے ہو تم اپنے پراون سے ہمارا قرضہ چکا رہے ہو۔ ارے مورکھ یہ پران ہمارے ہی تو دیے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری امانت ہے تمہارے پاس ــــ اگر تم انہیں ہم پر نچھاور بھی کر دو تو اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ تم قرض نہیں چکا رہے ہو ہماری امانت ہمیں لوٹا رہے ہو۔ تم اگر اپنی چمڑی کی جوتیاں بنا کر بھی ہمیں پہناؤ تو ہمارا احسان نہیں چکا پاؤ گے سمجھے۔"

ماں نے روتے ہوئے کہا۔

"ارے مجھے کیا پتہ تھا کہ میں نے نو مہینے تک اپنی کوکھ میں جس ماس کے لوتھڑے کو اپنا خون پلا کر جنم دیا ہے وہ ایک سپولا ہے۔ یہ مت بھول کہ تیری ایک ایک سانس میں میری سانس شامل ہے۔ تیری رگوں میں میرا ہی دودھ لہو بن کر دوڑ رہا ہے۔ تو مجھے کیا دے سکتا ہے۔ سات جنم تک بھی تو میرے پاؤں دھو دھو کر پیتا رہے گا تو میرے احسانوں کا بوجھ نہیں اُتار سکتا۔ اور آج بھی تو مجھے کون سا سونے کے جھولے میں جھلا رہا ہے۔ ایک آیا کی طرح تیرے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ تیری پتنی کی کھٹی میٹھی باتیں سہتی ہوں۔ صبح سے شام تک تیرے گھر میں داسی کی طرح کام کرتی ہوں تب تو دو وقت کی روٹی دیتا ہے۔ اتنا کام کسی اور کے گھر کروں تو دودھ ملائی کھانے کو ملے۔ تیرے گھر میں رُوکھا سوکھا کھا کر بھی کبھی شکایت نہیں کی۔ اور تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے؟ اپنی ماں پر ــــ ارے تو دود نہیں راکشس ہے راکشس۔ اب مجھے یہ سب دیکھنے سے پہلے

رو رہی تھی دوسری طرف سے تپنی سُو سے بہاتی رہی۔

"میرا تو مقدر ہی خراب تھا، جو اس گھر میں بیاہی گئی" پتاجی نے کہا تھا۔ اونچا گھرانہ ہے، خاندانی برہمن ہیں۔ عزت سے گھی روٹی کھاؤں گی۔ میں تو کہتی ہوں کسی شُودر کے گھر بیاہی ہوتی تو زیادہ سُکھی رہتی۔ اونچے گھرانے کو لے کر کیا چاٹوں؟ نہ کبھی من بھر کھایا نہ تن بھر پہنا۔۔۔ اس پر ساس سسر کی جھک جھک۔۔۔ ودھوا نند اگ چھاتی پر سوار رہتی ہے۔ بچوں کی پرورش، پتی کی سیوا۔ میں تو بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ مجھے جتنی جلدی ہو سکے اس نرک سے مُکتی دے دے۔"

بہن بھی رونے لگی تھی۔

"آخر میں ہی سب کی نظر میں کھٹکتی ہوں نا، بھگوان کسی کو ایسا نصیبہ نہ دے۔ میں سمجھتی تھی جب تک میرے بھیا کا سایہ میرے سر پر ہے مجھے اس سنسار میں کسی کی چنتا نہیں۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا بھائی میرے اور میرے بچوں کے نوالے گنتا ہے۔ ارے روٹی کا کیا ہے وہ تو کسی ودھوا آشرم میں چلی جاؤں تو زندگی بھر ملتی رہے گی۔ بچے بھی کسی اناتھ آشرم میں پل جائیں گے۔ مگر میں یہاں یہی سوچ کر آئی تھی کہ خاندان کی مریادا اور عزت کا سوال ہے۔ بھائی پر لوگ اُنگلیاں اٹھائیں گے۔ پتا شری کو بدنام کریں گے۔ گر میں تم لوگوں پر بوجھ ہوں تو کل ہی اپنے بچوں کو لے کر کہیں چلی جاؤں گی۔ ایشور کی دھرتی بہت بڑی ہے۔"

چاروں کی یہ کڑوی مگر بے لاگ باتیں سُن کر بے چارہ یہ دوسرا شردون کمار بہت سٹ پٹایا۔ وہ خود اپنے ہی شبدوں کے جال میں پھنس گیا تھا۔ گڑگڑا کر بولا:

"ایشور کے لیے تم لوگ میری باتوں کا غلط مطلب نہ لو۔ میں نے تم لوگوں کی سیوا سے انکار نہیں کیا ہے۔ کر بھی نہیں سکتا۔۔۔ اگر ایسا کروں تو اگلے جنم میں چانڈال کے گھر پیدا ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ مجھے بتائیں کہ میری سیوا میں کیا کمی ہے۔ جو آپ لوگ مجھ سے یوں خفا ہیں۔ میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کے من کو دُکھا کر میں کبھی سُکھی نہیں ہو سکتا۔ میں تو جنم جنم آپ لوگوں کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو میرا پریم کرتویہ ہے اور کرتویہ کا پالن کرنا میرا دھرم ہے۔"

شردون کمار کو یوں نرم دیکھ کر سبھی نے راحت کی سانس لی اور سب کے چہروں پر ایک بار پھر

اطمینان اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ باپ نے دوبارہ کھنکھار کر گلا صاف کیا اور غم کا دوسرا گھونٹ پی کر بدن میں تھوکتا ہوا بولا۔

"بیٹا! تو ہمیں جتنی غلاظت سمجھ۔ ہم لوگ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایک تو دکھائی نہیں دیتا۔ اس پریشانی کچھ کم دیتا ہے۔ بڑھاپے نے مت ہی مار دی ہے۔ اب پتہ نہیں کب آنکھ بند ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ تو نے ہماری بڑی سیوا کی ہے۔ اب ہماری آخری اچھا بھی پوری کردے تو یہ جنم سپھل ہو جائے۔ ہمیں ایک بار کاشی دھام لے چل تاکہ پوتر گنگا میں اشنان کر کے اپنے گناہوں کا پرائشچت کریں۔ اور اپنے آخری سفر کے لیے تیار ہو جائیں۔"

ماں نے بھی چادر سے آنسو پونچھ لیے۔ اور دلارتی ہوئی بولی۔

"ہاں بیٹا! بس یہی آخری اچھا ہے۔ اگر یہ اچھا پوری نہیں ہوئی تو ہماری آتمائیں جنگل ڈھوروں کی طرح بھٹکتی رہ جائیں گی۔ تو ہی تو ہمارا کرتا دھرتا ہے۔ اب تیرے سوا کون ہماری یہ اچھا پوری کرے گا۔"

پتنی بھی پیچھے پر کیسے چپ رہتی ہوئی بولی:

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ میں آپ کے بنا یہاں ایک پل نہیں رہ سکتی۔ آپ کے بنا تو یہ گھر کاٹنے دوڑے گا مجھے۔ راستے میں آپ کی اور ماتا پتا کی سیوا کر کے اپنے تینوں لوک پاون کروں گی۔"

بہن نے نہایت عاجزی سے کہا:

"بھیا مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو شما کر دینا۔ آخر تم لوگوں کے سوا اس سنسار میں میرا اور کون ہے؟ تم ہی لوگوں کے سہارے تو دن کاٹ رہی ہوں۔ جہاں بھی جاؤ اس دکھیا بہن کو بھی ساتھ لے چلو بھیا۔ اپنے بچوں کی داسی سمجھ کر لے چلو۔ مجھے بھی آپ لوگوں کی سیوا کا پُن ملے گا۔ اور میرا جنم سپھل ہو جائے گا۔"

شرون کمار کاشی یاترا کی بات پر پہلے تو چونکا پھر بہت گھبرایا۔ انہیں سمجھاتے ہوئے بولا:

"آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کاشی یاترا کیا بچوں کا کھیل ہے۔ راستے میں سینکڑوں دشواریاں ہیں۔ ندی نالے، پہاڑ، بیابان، لشٹ پشٹ، آندھی طوفان، چور ڈاکو، بھوک پیاس، نہیں نہیں کاشی یاترا کی بات من سے نکال دو۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔"

مگر وہ ایک ہی بات پر اڑے رہے کہ جب سورگیہ شرون کمار اپنے ماتا پتا کو لے کر کاشی کا سفر کر سکتا ہے تو تم کیوں نہیں کر سکتے ۔ ایشور کا نام لے کر نکل چلو سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ آخر بےچارے اس دوسرے شرون کمار نے بھی کاشی یاترا کی تیاری شروع کر دی ۔ کیوں کہ کاشی یاترا سے روکنا مہا پاپ تھا ۔ دوسرے یہ کہ اُسے اپنے نام کی بھی تو لاج رکھنی تھی ۔ اُسے مجبوراً راضی ہونا ہی پڑا ۔

پہلے شرون کمار کے ساتھ صرف اُس کے ماتا پتا تھے ۔ اس لیے اُس نے ایک بہنگی بنائی تھی اور اُنہیں اُس میں بٹھا کر کاشی دھام کی اور چل پڑا تھا ۔ یہاں تو ماتا پتا ، پتنی ، بہن اور چھ بچے ۔ یک پورا تن فوج تھا ۔ ان سب کو اتنے دُور دراز کے سفر پر کس طرح لے جائے ۔ آخر بہت غور کرنے کے بعد اس کے دماغ میں ایک ترکیب آگئی ۔ اُس نے لکڑی کے دو پہیوں والی ایک گاڑی تیار کی ۔ سب کو گاڑی میں بٹھایا ، تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان بھی رکھ لیا ۔ گاڑی کے سامنے ایک مضبوط رسی باندھی اور اس رسی کا دوسرا چھور اپنی کمر میں کس لیا ۔ اب وہ کاشی یاترا کے لیے تیار تھا ۔

ماتا پتا نے بیٹے کو منہ بھر دُعائیں دیں ۔ پتنی نے پیاری پیاری باتوں سے اس کا حوصلہ بڑھایا ۔ بہن بھائی کی محبت ، در دیرتا کے گُن گانے لگی ۔ بچے خوشی سے طوطا مینا کی طرح بولنے لگے ۔

جب دوسرا شرون کمار اپنے پریوار کو گاڑی میں لے کر کاشی کی طرف چلا تو پورا گاؤں اُسے رخصت کرنے کو اکٹھا ہو گیا ۔ ہر شخص اُس کی جواں مردی اور فرض شناسی کی تعریف کر رہا تھا ۔ لوگ تھوڑی دیر کے لیے ستیوگی شرون کمار اور اس کی درد بھری مَوت کو بھول گئے ۔ دوسرے شرون کمار کو بھی لوگوں کی باتیں سُن سُن کر ایک نیا حوصلہ ملا اور وہ گاڑی کو کھینچتا کھانچتا کاشی دھام کی طرف چل پڑا ۔

گاؤں والے دُور تک اُس کی جے جے کار کرتے اُس کے ساتھ آئے ۔ آخر گاؤں کی سرحد پر سب اُسے رخصت کر کے لَوٹ گئے ۔ شرون کمار ندی نالے ، جنگل ، بیابان پار کرتا ، آندھی طوفان سے جوجھتا ، موسموں کے تیور سہتا ، رات دن سفر کرتا ، کاشی کی اور بڑھا چلا جا رہا تھا ۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے ، شرون کمار کا سفر جاری تھا ۔ ماتا پتا ، پتنی ، بہن کاشی درشن اور گنگا اشنان کی کلپنا سے سُکھی تھے ۔ بچوں کو اس یاترا نے نہال کر دیا تھا ۔ البتہ شرون کمار کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی ۔ گاڑی کھینچتے کھینچتے اُس کی کمر اور بازوؤں پر سانپ کی کُنڈلی جیسے نشان پڑ گئے تھے ۔ جگہ جگہ سے کھال چھِل گئی تھی ۔ چلتے چلتے پیروں میں چھالے پھُٹ کر زخم بن گئے تھے ۔ سر اور داڑھی

کے بال اس قدر بڑھ گئے تھے کہ پورا چہرہ بالوں سے ڈھک گیا تھا۔ بس اندر کو دھنسی ہوئی دو آنکھیں چمکتی رہتیں جیسے کسی گھنی جھاڑی میں دو چراغ روشن ہوں۔ اس کے پورے جسم پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جس پر زخم یا داغ کے نشان نہ ہوں۔ وہ اس قدر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا کہ کسی پرانی دیوار کی طرح کسی بھی وقت ڈھے سکتا تھا۔ مگر وہ چل رہا تھا۔ گاڑی کھینچ رہا تھا اور کاشی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہاں وہ رک سکتا تھا، مگر اب رکنا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا اور بس لوٹنا آگے بڑھنے سے زیادہ دشوار تھا پھر لوٹنے کی شرمندگی تو موت سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اسے آگے بڑھتے بڑھتے مر جانا گوارا تھا۔ مگر واپس لوٹ کر بے عزتی اور شرمندگی کے ساتھ جینے کا تصور بھی اذیت ناک تھا۔

وہ چلتا رہا۔ شب و روز چلتا رہا۔ آخر چلتے چلتے وہ سریو ندی کے کنارے پہنچ گئے جہاں سوگیہ شرون کمار کے اندھے ماتاپتا کو پیاس لگی تھی اور اس نے انہیں بہنگی سے اتار کر ایک برگد کے نیچے بٹھا دیا تھا اور خود مٹکا لے کر پانی لینے کے لیے سریو ندی پر چلا گیا تھا۔ جہاں جہاں سے راجہ دشرتھ کے تیر کا شکار ہوا تھا۔

وہ پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ اس کے ماتاپتا نے پوچھا۔

"بیٹا شرون، یہ کون سی جگہ ہے ؟"

شرون کمار نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ سریو ندی کے کنارے آگئے ہیں۔"

"آہا تو یہ وہی سریو ندی ہے جس کے کنارے تپسوی کمار راجہ دشرتھ کے تیر کا شکار ہوا تھا۔"

"ہاں، یہ وہی ندی ہے۔"

"اور وہ برگد کا پیڑ بھی یہیں ہے، جس کے نیچے تپسوی کمار کے ماتاپتا ٹھہرے تھے ؟"

"ہاں —— یہیں ہے۔"

"ارے تو پھر ہم بھی اس پیڑ کی چھایا میں وشرام کریں گے بیٹا! رات بھی تو ہو گئی ہے۔ کیوں بہو ؟"

"ہاں ہاں، میں بھی اس پیڑ کی چھایا میں ٹھہرنے کا پن کمانا چاہتی ہوں۔" بہو نے حامی بھری۔

"اور میں بھی۔" بہن نے تائید کی۔

آخر سب کی صلاح سے یہی طے پایا کہ وہ لوگ آج رات اسی پیڑ کے نیچے ڈیرہ ڈالیں گے۔
سب لوگ گاڑی سے اُتر گئے۔ باپ نے شرون کمار سے کہا۔ "جاؤ بیٹا مٹکا لو اور سریو ندی کا پوتر نرمل جل لے آؤ ـــ سو گویہ شرون کمار نے بھی یہی کیا تھا۔"
ماں بھی ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی۔
"ہاں بیٹے! بے چارے تپسوی کمار کے ماتا پتا تو وہ جل پی نہیں سکے، مگر ہمیں اس امرت جل سے تریپت ہونے کا موقع ملا ہے۔ یہ ہمارے لیے بڑے بھاگیہ کی بات ہے۔"
شرون کمار نے کسی فرماں بردار بیٹے کی طرح مٹکا اُٹھایا اور ندی کی طرف چل پڑا۔
چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کہیں سے کسی رت کیڑے کی کرکر سنائی دے جاتی یا پھر کسی پیڑ پر کوئی پرندہ پھڑ پھڑ کر رہ جاتا۔ شرون کمار ندی کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک عجیب خیال اُس کے ذہن میں آیا اور اُس خیال کے آتے ہی پہلے تو بری طرح چونکا مگر دوسرے ہی لمحے اندھیرے میں اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اُس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند پھیل گیا۔
ہاں کتنا اچھا ہو، اگر آج کی رات بھی راجہ دشرتھ شکار کے لیے آگئے ہوں اور وہ آج بھی غلطی سے تیر چلا دیں اور تیر سیدھا میرے سینے میں پیوست ہو جائے۔ اور میں اس بوجھل، تھکا دینے والے ناقابلِ برداشت زندگی کے بوجھ سے نجات پا جاؤں۔ آہ کتنا اچھا ہو ـــ کاش آج بھی راجہ دشرتھ آئیں۔
اور ـــ اور ـــ بس ایک تیر ـــ صرف ایک تیر۔ اور قصہ تمام۔
وہ ندی کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ پانچویں چھٹی کے چاند کا عکس ندی کے پانی میں جھل مل جھل مل کر رہا تھا۔ ندی کے دونوں طرف گھنے اونچے پیڑوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ شرون کمار نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اور پھر کنکھیوں سے آس پاس کے پیڑوں کی جانب دیکھا۔ ایک لمحہ رُکا اور پھر مٹکا پانی میں ڈبو دیا۔
ڈب ـ ڈب ـ ڈب ـ ڈب کی آواز آئی اور مٹکا پانی سے بھرنے لگا۔
وہ سوچنے لگا یہ ڈب ڈب کی آواز دیر تک آتی رہے کیوں کہ پانی بھرنے کی آواز پر ہی تو راجہ دشرتھ نے یہ سمجھ کر کہ کوئی ہاتھی پانی پینے آیا ہے، تیر چلا دیا تھا۔ اور تیر شرون کمار کے جا لگا تھا۔ شرون کمار کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

اب آئے گا ــــ اب آئے گا ــــ مگر تیر نہیں آیا ــــ شام کا دُھندلکا گہرا ہو گیا۔
مگر تیر نہیں آیا ــــ وہ مشکا کاندھے پر رکھے کھڑا بھی ہو گیا۔ مگر تیر نہیں آیا ــــ مایوسی
سے اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دُبکے درختوں کے
ٹیڑھے سلسلے کی جانب حسرت سے دیکھتا رہا ــــ مگر تیر نہیں آیا۔

آخر اُس نے ایک سرد آہ کھینچی اور مشکا کاندھے پر سے لڑکھڑاتے قدموں سے
واپس برگد کے پیڑ کی طرف مُڑ گیا۔ جہاں اُس کے ماتا، پتا، پتنی، بہن اور بچے اُس
کا انتظار کر رہے تھے ــــ ●●

خوں بہا

میری رگوں میں جہنم کدہ دہک رہا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر محسوس کر سکتا تھا کہ جسم سے بھاپ یوں اٹھ رہی ہوگی جیسے سمندر سے آبخرات اٹھتے ہیں۔ گلے میں بار بار سوئیاں سی گڑ رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کوئی سرہانے بیٹھا متواتر حلق میں پانی کے قطرے ٹپکاتا رہے۔ مگر وہاں کون تھا؟ اگر بس چلتا تو میں خود اپنے وجود کا گھڑ موت کے گھاٹ اتار آتا کہ پچھلے تین روز سے خود اپنا وجود ناقابل برداشت بوجھ بن گیا تھا۔

ابھی ابھی رگھو چپکے سے بتا گیا تھا کہ پٹیل کے مکان پر تھانے دار آیا ہے۔ تحقیقات کے لیے اس کے ساتھ چار سپاہی بھی ہیں۔ پٹیل نے اس کے لیے اپنی کوٹھی میں ایک کمرہ مختص کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ جہنم کی حرارت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا۔ رگھو مجھے وید کی دی ہوئی پڑیا کھلا کر میرے حلق میں پانی کے دو گھونٹ انڈیل کر جا چکا تھا۔ مگر اس کی دی ہوئی اطلاع میرے کانوں میں ابھی تک برمے کی طرح گھوم رہی ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے مگر ہوا بالکل بند ہے۔ باہر تالاب، قبرستان اور بڑی سڑک تک پھیلے دھان کے کھیتوں پر دھوپ فولاد کی چادر کی طرح تنی ہوئی ہے۔ حبس سے گھبرا کر رگھو سے کھڑکی کھول دینے کو کہا تھا مگر اب دھوپ کی کرچیں آنکھوں میں اس بری طرح چبھ رہی ہیں کہ باہر ایک نگاہ دیکھنا بھی بے حد تکلیف دہ ہے۔ اٹھ کر کھڑکی بند کر دینا چاہتا ہوں مگر بدن پر جیسے کسی نے بڑی بڑی پتھر کی سلیں رکھ دی ہوں۔ اٹھنا تو کجا کروٹ لینا محال ہے۔ مگر نہیں اٹھنا تو پڑے گا ہی۔ اگر آج اس طرح سو تا رہ گیا تو

پھر کبھی نہ اُٹھ سکوں گا۔ چھت پر چڑھتی اس بیل کو سہارا ہی ہوگا۔ ورنہ حیثیت تو پڑے کیچڑ کی طرح چپ چاپ
رہ جاؤں گا۔ دائیں ہاتھ کی کہنی پر زور دے کر ایک جھٹکے سے اُٹھتا ہوں۔ اُٹھ کر کھاٹ پر بیٹھ بھی جاتا ہوں۔
مگر دوسرے ہی لمحے لگتا ہے اچانک میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا ہوں اور چاروں طرف سے ہوا کے تیز تھپیڑے
چلنے لگے ہیں۔ سائیں — سائیں — کان بج اُٹھتے ہیں۔ بدن کانپتا ہے اور میں پہاڑ کی چوٹی سے
ڈھلکتا چٹانوں سے ٹکراتا، جھاڑیوں سے اُلجھتا کھائی میں آ گرتا ہوں۔

تکیے پر سر رکھے اوندھے منہ گہری گہری سانسیں لیتا ہوں۔ آنکھیں بند کرکے تھوڑی دیر تک
ہانپتے رہنے کے بعد سرہانے پڑے تولیے سے ماتھے اور گردن کا پسینہ پونچھتا ہوں۔ پھر بستر پر
چت لیٹ جاتا ہوں۔ کھڑکی سے باہر دھوپ اُسی طرح پرچھائیاں تانے کھڑی ہے۔ ایک لمحے کو
سوچتا ہوں گھو کی بات مان لوں۔ شام کو ساڑھے چھ بجے کی ٹرین سے گھر چلا جاؤں۔ مگر اب کہیں
بھی جاؤں وہ منظر پرچھائیں کی طرح میرے ساتھ جائے گا۔ وہ منظر جس کا میں خود ایک جزو
بن گیا ہوں۔ بلکہ وہ پورا منظر میرے وجود میں کسی گھٹتے سمندر کی طرح سانسیں لے رہا ہے۔ اور
میری آتما ایک بے بس تنکے کی طرح اُس سمندر میں غوطے کھا رہی ہے۔ پچھلے تین روز سے کتنی
بار یہ منظر آنکھوں میں تصویر ہوا اور پھر اوجھل ہوگیا۔

شام کے سائے ڈوب چکے ہیں۔ سورج پہاڑ کی اوٹ سے کسی دیو کی غضبناک آنکھ کی طرح
گھور رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیو کی آنکھ بھی جھپک گئی۔ شام کے دھندلکے اُجالے میں ہنومان مندر
کا کلس دکھائی دے رہا ہے۔ اتنے میں مندر کے پیچھے سے کوئی بھاگتا ہوا نکلا اور تیزی سے دائیں طرف
دھان کے کھیتوں میں اُتر گیا۔ اُس کے پیچھے سات آٹھ لوگ لاٹھیاں لیے نکلے اور بھاگنے والے شخص
کے پیچھے وہ بھی کھیتوں میں اُتر گئے۔ پھر وہ نیم دائرے کی شکل میں دوڑتے ہوئے بھاگنے والے
شخص کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔ تبھی ٹھٹھک کر وہ پیپل کے نیچے ہی رُک گیا۔ کھیت
کٹ چکے تھے۔ پودوں کی کٹی ہوئی جڑیں کھونٹیوں کی طرح زمین سے سر نکالے کھڑی تھیں۔ کھیتوں میں
دوڑتے لوگوں کو اُن کھونٹیوں کی وجہ سے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ
لوگ برابر دوڑ رہے تھے اب آگے بھاگنے والے شخص کی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔

کیوں کہ وہ لڑکھڑا لڑکھڑا کر دوڑ رہا تھا۔ شاید اُس کا پاؤں زخمی تھا۔ تعاقب کرنے والے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اتنے میں آگے بھاگنے والا شخص کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ اور دم کی دم میں پیچھا کرنے والے اُس کے سر پر پہنچ گئے۔ پھر کسی کی لاٹھی اُس کے سر پر پڑی اور ایک دردناک چیخ دور تک گونجتی چلی گئی۔ کوئی چلّایا۔ "زندہ مت چھوڑو۔ مارو ــــ مار ڈالو۔"

اچانک اُن میں سے ایک، دو قدم پیچھے ہٹا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے بلّم کو تولا اور پوری طاقت سے بلّم کی انی گرنے والے کے سینے میں گاڑ دی۔ ایک تیز مگر ڈوبتی کراہ کے ساتھ باقی سبھوں کی لاٹھیاں ہوا میں تیرتی رہ گئیں۔ میں نے کانپ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب کھولیں تو مارنے والا زخمی شخص کے سینے سے اپنے بلّم کو کھینچ لینے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ ایک پارہ پارہ خون آلود جسم بلّم کے ساتھ ہی نصف کے قریب اوپر کو اُٹھ آیا تھا۔ بلّم کی نوک شاید زخمی شخص کی پسلیوں میں پھنس گئی تھی ــ بیک وقت چار پانچ لاٹھیاں ہوا میں لہرئیں اور ایک ساتھ اُس انسانی جسم پر پڑیں۔ زخمی شخص کا بے جان جسم کسی لٹھے کی طرح دھپ سے زمین پر گر گیا۔

"کون ہے اُدھر؟"

آواز شری کانت کی تھی۔ میں نے نیم کے نیچے یوں کھڑا تھا جیسے میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہوں۔ چاروں طرف اب اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"ارے کوئی بھی ہو۔ جانے مت دو حرامجادے کو۔"

وہ سب لاٹھیاں ٹھک ٹھکاتے میری طرف لپکے۔ اور مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شری کانت میرے قریب آیا۔ جھک کر میرا چہرہ دیکھا۔

"ارے یہ تو سالا ماسٹر ہے۔"

"کیوں ماسٹر! تے کھت کو یہاں کیا کرنے کو آیا تھا۔"

"ماسٹر بولو، نہیں تو تمھار بھی اِدھر ہی کریا کرم ہو جائے گا۔"

کسی نے میری کمر میں لاٹھی کا ٹھوکا دیا۔ میں کیا جواب دیتا۔ میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔

ماسٹر۔ بول نہیں تو بھی جینداں کر رکھ دوں گا۔ اِدھر تو کیا کرنے کو آیا تھا۔"

نہیں، نہیں دتّو! اس کو جانے دو۔ گاؤں کا ماسٹر ہے اس سے بعد میں بات کریں گے۔"
شری کانت بیچ میں آگیا۔

"مگر اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔"

"کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ سالا ماسٹر سالا، کیا کرسکتا ہے۔"

"تم جاؤ شری کانت! ہم اپنا کام کرچکے۔"

"چلو ماسٹر صاحب! اپنا راستہ ناپو۔ اور جو کچھ دیکھا اُسے بھول جاؤ۔ ورنہ ....."

پھر ایک لاٹھی سے میری کمر میں ٹھوکا دیتے ہوئے کوئی غرّایا۔

" چل بھاگ اِدھر سے۔ گانڈو ــ سالا ـــ "

'کھٹ، کھٹ،'

کون ہے؟' میں نے اپنی جلتی آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔

کھٹ، کھٹ،

"کون ہے آجاؤ، دروازہ کھُلا ہے۔"

دروازہ کھُلا اور پاٹل کا خاص نوکر گلاب راؤ میرے سامنے آکھڑا ہوا۔

گلاب راؤ تھوڑی دیر تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

" ماسٹر! پاٹل نے کل تیرے کو بُلایا تھا۔ کیوں نہیں آیا؟'

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیٹے لیٹے گلاب راؤ کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ گلاب راؤ نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چھوا۔

' ارے، تم کو تو بخار ہے۔' گلاب راؤ چند سیکنڈ تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "ٹھیک ہے ماسٹر! میں جاتا ہوں۔ جب بھی طبیعت ٹھیک ہو پاٹل سے آجانا۔ میں پاٹل سے بول دوں گا۔"

گلاب راؤ چلا گیا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کریں۔

پاٹل نے بُلایا ہے۔ پاٹل کے گھر تھانے دار آیا ہوا ہے۔ سستی کے قتل کی تفتیش کے لیے۔ پاٹل نے مجھے کیوں بُلایا ہے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

" تھانے دار صاحب ! میں نے خود اپنی آنکھوں سے شنتی کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ ہاں ،
قاتلوں کو میں جانتا ہوں۔ قاتل کوئی اور نہیں۔ آپ جس کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ یہی سب لوگ
شنتی کے قاتل ہیں۔"

مگر میں یہ سب کہہ پاؤں گا ؟

" چلو ماسٹر ! اپنا راستہ ناپو۔ اور جو کچھ دیکھا اُسے بھول جاؤ۔ ورنہ ......"
رگھو کہہ رہا تھا۔

" آج سویرے شنتی کی داہ کریا ہو گئی۔ بے چارے کا بوڑھا باپ ارتھی کو کاندھا دینے
بڑھا اور راستے ہی میں غش کھا کر گر پڑا۔"

جوان بیٹے کی ارتھی تو پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ بوڑھے مادھو کی سوکھی ٹانگوں
میں اتنی قوت کہاں ؟

میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہو۔
میں نے اپنے خشک گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

" رگھو ! پانی !! "

رگھو اس اچانک تبدیلی پر بوکھلا گیا۔ لپک کر صُراحی سے کٹورے میں پانی اُنڈیلا اور میرے
سر کو سہارا دیتا ہوا۔ کٹورا میرے مُنہ سے لگا دیا۔ میں نے دو تین گھونٹ پانی پیا۔ اور سر کو
تکیے پر رکھ کر ہانپنے لگا۔

" ماسٹر صاحب ! اب کیسا ہے ؟ وید کو بُلا کر لاؤں ؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کر دیا۔ پھر تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کر کے گہری
گہری سانسیں لیں۔ چند سیکنڈ بعد میں نے جب آنکھیں کھولیں تو رگھو مجھے تشویش آمیز نظروں
سے دیکھ رہا تھا۔

" اب کیسا ہے ؟ " اُس نے دوبارہ گھبرائے لہجے میں پوچھا۔

" ٹھیک ہے۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

" رگھو اب تو جا۔ کافی دیر ہو گئی۔ تجھے ڈھور ڈنگر بھی دیکھنے ہوں گے۔"

رگھو شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اور میرے سامنے ششتی کے بوڑھے باپ کا چہرہ گھوم گیا۔ ایک دُبلا پتلا شخص، رنگ کچھ دھوپ، کچھ غربت سے سنولایا ہوا۔ سر مُنڈا ہوا جس سے سفید بالوں کی کھونٹیاں جھانک رہی تھیں۔ آنکھیں گدلی اور مُنہ قریب قریب پوپلا۔ کپڑوں کے نام پر اُس کے چوتڑوں کے درمیان پھنسی ہوئی ایک لنگوٹی اور کاندھے پر ایک میلا سا گمچھا۔

"ماسٹر صاحب! ششتی آپ کی بہوت عجت کرتا ہے۔ آپ اُس کو جرا سمجھا دو، وہ آجکل پاٹل سے اُلجھا ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

"کہتا ہے مجوری بڑھا کر دو نہیں تو ہم لوگ کھیت میں کام نہیں کریں گے۔"

"مادھو۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "سبھی کھیت مزدور ششتی کے ساتھ ہیں۔"

"نہیں، ماسٹر صاب، دو چار کو چھوڑ کر کوئی بھی ششتی کے ساتھ نہیں ہے۔ پاٹل کے غنڈوں سے سبھی ڈرتے ہیں۔"

"اچھا تم اُسے میرے پاس بھیج دو، میں اُس سے بات کروں گا۔"

مگر ششتی میرے پاس نہیں آیا۔ شاید وہ جانتا تھا۔ مجھ جیسا معمولی، بزدل شالا ماسٹر اُس سے کیا کہے گا۔ کیا کہہ سکتا ہے۔

"کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ شالا ماسٹر کیا کر سکتا ہے؟"

واقعی شالا ماسٹر کیا کر سکتا ہے۔ اگر میں تھانے دار کے پاس پہنچ کر خود کو گواہ کی حیثیت سے پیش کر دوں؟ مگر تھانے دار تو پاٹل کے گھر بیٹھ کر پوچھ تاچھ کر رہا ہے، کیا وہ میرا بیان سُنے گا۔ اگر سُن بھی لیا تو بیان دینے کے بعد کیا ہوگا؟

"میں تو بولتا ہوں۔ اس کو بھی خلاص کر دینے۔ بعد میں کھٹ کھٹ مت ــــــ"

"ارے نہیں، تم نہیں سمجھتے۔ چلو ماسٹر! اپنا رستہ ناپو۔ اور دیکھو جو کچھ دیکھا اُس کو بھول جاؤ ورنہ ....."

میں نے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اپنی کنپٹیوں پر دباؤ ڈالا۔ تھوڑی دیر تک آنکھیں

بند کیے پڑا رہا۔ کنپٹیوں پر دباؤ ڈالنے سے دماغ میں اٹھتی ٹیسوں میں قدرے کمی کا احساس ہوا۔ جی چاہ رہا تھا کوئی پاس بیٹھا اسی طرح دھیرے دھیرے کنپٹیوں پر دباؤ ڈالتا رہے۔ اور میں تھوڑی دیر کے لیے سکون سے آنکھیں بند کیے پڑا رہوں۔ سونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ پچھلے تین دن سے جاگ رہا ہوں۔ اگر آنکھ جھپک بھی جاتی ہے تو خون میں لت پت ایک انسانی ہیولا سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور پھر چاروں طرف سے اس قدر دردناک چیخیں بلند ہوتی ہیں کہ میں ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں۔

پچھلی رات تو ایک بار اس بری طرح چیخا تھا کہ پڑوس سے رگھو دوڑتا ہوا آیا تھا۔ رگھو کی کاکی بھی ایک ٹوٹی لالٹین لٹکائے جس کی چمنی کالک اور دھوئیں سے اٹی ہوئی تھی، ایک ہاتھ کمر پر رکھے ٹٹولتی، ٹھوکریں کھاتی آگئی تھی۔

"ماشٹر ساب، ماشٹر ساب!"

باہر رگھو زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا تھا۔ میں بڑی مشکل سے چارپائی سے اٹھ پایا۔ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ اور دروازے کی سٹکنی گرا کر دوبارہ چارپائی پر آکر ڈھیر ہوگیا۔

"کیا ہوا ماشٹر ساب، کیا ہوا؟" رگھو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"کچھ نہیں رگھو ـــ مٹکے سے تھوڑا پانی پلا دے۔"

کاکی نے بھی میرا پنڈا چھوا اور بولی۔

"ارے رگھوا! ماشٹر کو بہت تاپ ہے رے۔"

رگھو مجھے سہارا دے کر اٹھاتا ہوا بولا۔

"کاکی! میں نے تو ساجھ ہی کو کہا تھا کہ وید سے دوا لے لو۔ مگر ماشٹر صاحب نہیں مانے۔"

میں نے دو گھونٹ پانی پی کر اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چار بج رہے تھے۔ کاکی لالٹین کو فرش پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جھکی ہوئی پُر تشویش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں پانی پی کر دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

"ماشٹر! چائے بنا کر بھیجوں ـــ دو گھونٹ گرم گرم چائے پیئں گا تو اچھا لگے گا رے!"

میں نے قریب ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں کاکی! اب رہنے دو۔ سویرا ہونے کو ہے۔"

"چا پییں گا تو بہوت فرق پڑے گا رے بابا! میرے پاس ہری چا کی پتّی ہے۔"

کاکی لالٹین اُٹھا کر دروازے کی طرف مُڑتی ہوئی بولی۔ پھر دو قدم چل کر رُکی اور پوچھا

"گُڑ کی چا چلیں گی نا رے بابا! ساکھر نہیں ہے میرے پاس۔"

میں نے کاکی کو پھر منع کرنا چاہا مگر نہیں کر سکا۔

"چلے گی کاکی! بس ایک پیالی بنانا زیادہ نہیں۔"

"اچھا ـــ اچھا ـــ"

کاکی باہر نکلتی ہوئی رگھو سے بولی۔

"رگھو! تھوڑی دیر سے آ کر چائے کر جا ـــ ہاں۔"

رگھو! فرش پر اُکڑوں بیٹھا میرا سر دبا رہا تھا۔ مجھے تھوڑی سی راحت کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگر رگھو اور کاکی نہ ہوتے تو شاید اُس رات میں اُسی طرح چیخ چیخ کر بے ہوش ہو جاتا۔

پچھلے تین دن سے رگھو میرے کمرے کی کئی کئی چکّر لگا چکا ہے۔ کبھی دوا پلاتا۔ کبھی کاکی کی دی ہوئی ہری پتّی کی چائے یا اُبلے چاولوں کی نیچ لا کر دیتا۔ سب سے پہلے اُسی نے مجھے آ کر بتایا تھا کہ کچھ نامعلوم لوگوں نے شتّی کو ہنومان مندر کے پاس والے کھیتوں میں قتل کر دیا ہے۔ پھر شام میں خبر دی کہ تحصیل سے تھانے دار آیا ہے۔ پنچ نامہ ہو رہا ہے۔ لاش شہر لے جائی گئی ہے۔ تیسرے روز لاش پوسٹ مارٹم کے بعد اُس کے بوڑھے باپ مادھو اور اُس کی بیوہ کے حوالے کر دی گئی ہے۔ صبح بتایا کہ ستّی کی ارتھی اُٹھائی گئی ہے۔ اور اُسے شمشان میں نذرِ آتش کر دیا گیا ہے۔ اور ابھی ابھی خبر دے گیا ہے کہ تھانے دار چار سپاہیوں کے ساتھ پٹیل کے گھر میں بیٹھا قتل کی تحقیقات کر رہا ہے۔ 'قاتل کے گھر میں قتل کی تحقیقات ـــ'

یہی سب سوچتے پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب دوبارہ آنکھ کھُلی تو دن ڈوب چکا تھا۔ سامنے چار پانچ مُرغابیاں تالاب میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ دور دن بھر جنگل میں چرنے والے ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو لوٹ رہے تھے۔ ایک چرواہا ـــــ یہہ، یہہ، یہہ کی آواز نکالتا، اپنا ڈنڈا بجاتا ریوڑ سے نکلے ایک بچھڑے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرے بدن کی ٹوٹن کم ہوگئی تھی۔ بخار اُتر چکا تھا۔ ذہنی تناؤ بھی غائب ہوگیا تھا۔
میں چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ قمیص پسینے سے تر تھی۔ میں اُٹھ کر موری کے پاس گیا۔ لوٹے میں پانی لے کر مُنہ پر پانی کے دو چار چھپاکے دیئے۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ پسینہ خشک ہو چکا تھا۔ مگر بدن اب بھی چپچپا چپچپا لگ رہا تھا۔ میں نے قمیص اُتاری اور دوسری قمیص پہن لی۔ پھر چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ ذہن میں پھر پچھلے واقعات کے مناظر یوں رینگنے لگے، جیسے اسٹیج سے دھیرے دھیرے پردہ سرکتا جا رہا ہو۔ میں اُن واقعات کو بار بار تصور میں دوہرا دوہرا کر مزید پریشان ہونا نہیں چاہتا تھا۔ تین دن سے جس کرب ناک عذاب سے گزر رہا تھا وہ میرا ہی دل جانتا تھا۔ مجھے ایک طویل عرصے کے لیے آرام کی ضرورت تھی ـــــ میں نے طے کر لیا کہ میں دو تین مہینے کی چھٹیاں لے کر گھر چلا جاؤں گا۔ اسی بیچ چپ چاپ یہاں سے تبادلہ کروالوں گا۔ اب میرا اس گاؤں میں رہنا، رہ کر کام کرنا بے حد مشکل تھا۔ چھٹی لینے سے پہلے پاٹل سے ملِ لینا ضروری تھا۔ پاٹل نے دو دو بار مجھے بُلا بھی بھیجا تھا۔ میں تین دن سے جس روحانی کرب سے گزر رہا تھا۔ اُس نے میری روح کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ اب اس سے زیادہ برداشت کرنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ مجھے جلد ہی اس گاؤں کو چھوڑ دینا ہوگا۔ یا یہاں سے اپنا تبادلہ کروا لینا ہوگا۔ مگر یہ سب اتنی جلدی کیونکر ممکن ہو سکے گا۔ چھٹی ـــــ ہاں دو تین مہینے کی لمبی چھٹی تو لے ہی سکتا ہوں۔ مگر لمبی چھٹی سے پہلے پاٹل سے مل لینا ضروری ہے۔ اسکول کی چابی بھی تو اُس کے حوالے کرنی ہوگی۔ میں دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے اُٹھا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ اب داڑھی بنانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کنگھی اُٹھائی۔ اِدھر اُدھر بالوں کو جمایا۔ چپلیں پہنیں اور گھر سے باہر نکل گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہیں رگھو نہ مل جائے۔ ورنہ اس حالت میں وہ مجھے اکیلے کہیں نہیں جانے دیتا۔ خود بھی ساتھ ہو لیتا۔ میں اُسے اپنے ساتھ لیجانا نہیں چاہتا تھا۔ میں مکان کے پچھواڑے سے گھوم کر پاٹل کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گھروں میں دیئے جل

ٹنگے تھے۔ بعض دُوکانوں میں گیس کی بتیاں جھک جھکا رہی تھیں۔ دو ایک جان پہچان والے ملے۔ اُنہوں نے پرنام کیا۔ میں نے پرنام کا جواب دیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ جب میں پاٹل کے گھر کے سامنے پہنچا تو اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پاٹل کے مکان کے سامنے چھت سے ایک بڑی سی گیس لالٹین لٹک رہی تھی۔ جس کی تیز روشنی سے پورا ورانڈا روشن تھا۔ میں پھاٹک سے داخل ہو کر ورانڈے میں پہنچ گیا۔ ورانڈے میں ایک دری بچھائے پولیس کے چار سپاہی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ غالباً یہ وہی چار سپاہی تھے جو تھانے دار کے ساتھ تحصیل سے قتل کی تحقیق کے لیے آئے تھے۔ میرے ورانڈے میں داخل ہوتے ہی اُن چاروں نے عجیب رنگی پلٹ کر مجھے دیکھا، اور پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گئے۔ میں ورانڈے کے ایک ستون کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ نقاہت کی وجہ سے اتنی سی مسافت ہی میں میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ میں ستون سے ٹیک لگائے ایک منٹ تک سستاتا رہا۔ اتنے میں کہیں سے کُتّے کے غرّانے کی آواز آئی۔ اور اس سے پہلے کہ میں پاٹل کو آواز دیتا ایک بڑا سا کتا غرّاتا ہوا مکان کے اندر سے باہر نکلا۔ میں نے گھبرا کر آواز دی۔ "پاٹل صاحب!"

کتا مجھ سے صرف دو بالشت کے فاصلے پر کھڑا گردن اُٹھائے بھونک رہا تھا۔ اندر سے کسی نے پکارا۔ "موتی ـــــ موتی ـــــ"

اور ساتھ ہی گلاب راؤ باہر نکلا۔ "موتی، موتی ـــــ" گلاب راؤ نے کتے کو پچکارا۔ اور موتی نے بھونکنا بند کر دیا۔ مگر اُس کی غرّاہٹ اب بھی جاری تھی۔ میری جان میں جان آئی۔ گلاب راؤ نے مجھے پہچان لیا۔

"ارے ماسٹر، تم ـــــ"

"پاٹل صاحب ہیں گھر میں؟"

"ماسٹر! تم کو دن میں آنا تھا۔ تم رات میں چلے آئے۔ پاٹل گھر پر ہیں۔ مگر تھانے دار صاحب کے ساتھ کچھ ضروری بات چیت کر رہے ہیں۔"

"ارے کون ہے؟ ـــــ کیا بات ہے؟"

ورانڈے میں پسر کر بیٹھے اُن چار سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے للکارا۔

"کچھ نہیں ـــــ یہ گاؤں کا شالا ماسٹر ہے۔ پاٹل سے ملنے کو آیا ہے۔" گلاب راؤ نے صفائی پیش کی۔

" اُس کو بولو ، کل آکر ملو ۔ ابھی پاٹل ہمارے صاب کے ساتھ بیٹھا ہے ۔ ابھی پاٹل کسی سے نہیں ملے گا ۔"

گلاب راؤ میری طرف جھک کر ڈرنے اور ڈرانے والے لہجے میں بولا ۔ " حولدار صاب ہے۔ بڑے صاب کے ساتھ آئے ہیں ۔ تم کل سویرے آکر ملونا ماسٹر پاٹل سے ۔ ابھی رات میں کیا کرو گے مِل کر ؟ "

" گلاب راؤ مجھے پاٹل نے بُلایا تھا ۔ جاکر پاٹل سے کہو ، میں آیا ہوں ۔ اگر اُنہوں نے بُلا لیا تو مِل لوں گا ۔ ورنہ سویرے آؤں گا ۔"

" ارے گلاب راؤ ! اس کو بولو ، سویرے آکر پاٹل سے ملو ۔ نہیں تو صاب غصّہ کرے گا ۔"

" گلاب راؤ ! جاؤ پاٹل کو میرے آنے کی خبر کرو ۔" میں نے حولدار کی بات سُنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

" گلاب راؤ اندر جانے کا نہیں ـــــ " حولدار گلاب راؤ کو دھمکانے لگا۔

" پر صاب، پاٹل نے ان کو بُلایا تھا ۔ یہ سچّی بات ہے ۔"

" ارے بُلایا تھا تو کل بھی مِل سکتا ہے ۔ آخر اتنی کے اتنی ملنے کے لیے یہ ہے کون ؟ "

" صاب ! یہ ہمارے گاؤں کا شالا ماسٹر ہے ۔"

" شالا ماسٹر ہے نا ، لاٹ گورنر تو نہیں ہے ۔"

اتنے میں اندر سے پاٹل کی دہاڑ سُنائی دی ۔

" کون ہے رے ، گلاب ! "

شاید پاٹل نے ہماری تکرار سُن لی تھی ۔ گلاب راؤ لپک کر اندر چلا گیا ۔ مونچھوں والا حولدار مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا ۔ تھوڑی دیر بعد گلاب راؤ پھر واپس آگیا۔

" چلو ماسٹر ! پاٹل نے بُلایا ہے ۔"

میں ہیبڑے حولدار پہ ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا گلاب راؤ کے پیچھے اندر چلا گیا ۔ وہ مجھے بغل کے ایک کمرے میں لے گیا ۔ کمرے میں کیروسین کے بڑے بڑے دو لیمپوں کا گدلا گدلا اُجالا پھیلا ہوا تھا ۔ سامنے ایک صوفہ بچھا ہوا تھا ۔ ایک طرف ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں ۔ دیواروں پہ کچھ تصاویر آویزاں تھیں ۔ گلاب راؤ مجھے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا ۔ میں تذبذب کے عالم میں کھڑا کمرے کا

جائزہ لینے لگا۔

ایک کیروسین لیمپ کے پاس ہی دیوار پر ٹنگی ایک تصویر میں رام اور کرشن ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک تتلی بیٹھی تھی اُس کے سامنے پیروں سے بھری ٹوکری تھی۔ وہ اُن دونوں کو پیر کھلا رہی تھی۔ دوسرے لیمپ کے اِدھر اُدھر دیوار پر ہرنوں کے دو سر لگے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک دونالی بندوق ٹنگی ہوئی تھی۔

معاً اپنی پشت پر مجھے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میں چونک کر پلٹا۔ پاٹل اپنے بڑے ڈیل ڈول کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس کی نکیلی مونچھیں اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا اور بھویں تن گئی تھیں۔

" ماسٹر! ـــ تم آگئے ؟"

پاٹل ایک کُرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔ " بیٹھو! کھڑے کیوں ہو؟ "

"گلاب راؤ بول رہا تھا۔ تم بیمار ہو"

" ہاں پاٹل میں تین دن سے بیمار ہوں "

" اچھا ـــ اچھا ـــ ٹھیک ہے۔ ماسٹر! تم ایک دو مہینے کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلے جاؤ۔ تم کو آرام کی ضرورت ہے "

پاٹل کے لہجے سے ہمدردی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

" ہاں پاٹل! میں بھی یہی کہنے آیا تھا"

"کب جا رہے ہو ؟ "

" سویرے کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ یہ اسکول کی چابی رکھئے "

میں نے اسکول کی چابی اس کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے چابی لے لی۔

" کٹیشن تک گلاب راؤ کو بھیج دوں ـــ "

" نہیں ـــ نہیں ـــ میں چلا جاؤں گا "

" اچھا ماسٹر، چھٹی میں خرچے پانی کے لیے رکھو۔

پاٹل نے جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ پانچ ہزار روپے ہیں "

"پاٹل صاحب!" میں جھٹکے سے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ غصہ، ذلت اور ندامت سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔

"بیٹھو ماسٹر، بیٹھو ــــ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔"

"پاٹل صاحب! اب مجھے اتنا ذلیل تو مت کرو۔"

میرے الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے۔

"ماسٹر! مجھے غلط مت سمجھو، جو کچھ ہوا اُس کا مجھے بھی بے حد دکھ ہے۔ مگر یہ چھوکرے کب کسی کی سنتے ہیں۔ اب یہی دیکھو، غلطی یہ لوگ کرتے ہیں۔ بھگتنا ہم کو پڑتا ہے۔"

پاٹل نے یہ بات کچھ اتنے پُرسکون انداز میں کہا۔ جیسے نتری کانت اور دتّو نے شِشی کا قتل نہ کیا ہو محض پڑوس کی بیری پر ایک آدھ پتھر مار دیا ہو۔ میں چپ رہا۔ یک بیک شِشی کی خون میں ڈوبی لاش میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ میرے کان انسانی چیخوں سے گونج اُٹھے۔ اُس کا باپ ایک ارتھی کو کاندھا دیئے لڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا۔

"پاٹل مجھے سب معلوم ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔ اب مجھے جانے دو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ میں ہلکے ہلکے ہانپ بھی رہا تھا۔

"ماسٹر! پریشان مت ہو، تم سیدھے سادے آدمی ہو۔ تم نہیں جانتے یہ سب ہر جگہ ہوتا رہتا ہے۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ چھوکرے اس حد تک بڑھ جائیں گے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ ان روپیوں کا غلط مطلب مت لو۔ تم دو تین مہینے چھٹی پر رہو گے۔ تمھیں روپیوں کی ضرورت ہوگی۔ انھیں رکھو اپنے گاؤں جا کر اپنا علاج بھی کرنا۔" پاٹل دو قدم آگے بڑھا۔ اُس نے وہ لفافہ میری جیب میں ٹھونس دیا۔ مجھے تعجب ہے کہ میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک کیوں نہیں دیا۔

پاٹل نے دروازے کی طرف مُڑ کر پکارا۔

"گلاب راؤ!"

گلاب راؤ اندر آیا۔

"گلاب راؤ! ماسٹر کو گھر تک چھوڑ آؤ۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ــــ
ــــ اچھا ماسٹر! ــــ" پاٹل میرے کاندھے کو تھپتھپاتا ہوا اُٹھتے ہوئے دوسری رٹ گیا۔
میں بیچ کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ گلاب راؤ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔
"چلو ماسٹر!"
اور میں سحر زدہ سا اُس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ ورانڈے سے گزرتے ہوئے پیچھے
سے حوالدار کی آواز آئی۔
"گلاب راؤ! کدھر؟"
گلاب راؤ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اُس نے شاید پلٹ کر اُنہیں اشارے سے
کچھ کہا۔ چاروں حوالدار ہی ہی کر کے ہنسنے لگے۔ میں پھاٹک سے باہر نکل آیا۔ گلاب راؤ
اب میرے ساتھ آگیا تھا۔
"کیا ماسٹر! کیا بولا پاٹل نے ــــ؟"
میں نے ایک اُچٹتی سی نگاہ اُس پر ڈالی۔ اندھیرے کی وجہ سے اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔
میں چلتے چلتے رُک گیا۔
"گلاب راؤ، تم واپس جاؤ ــــ میں چلا جاؤں گا گھر ــــ"
"ارے نہیں ماسٹر! چلو میں گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔"
"میں نے کہا نا ــــ میں چلا جاؤں گا۔ میری فکر مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔"
"میں واپس گیا تو پاٹل غصہ ہوگا ماسٹر!"
"نہیں ہوں گے ــــ تم کہہ دینا میں نے واپس کر دیا ہے۔"
گلاب راؤ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا سا کھڑا رہا۔ پھر کاندھے جھٹک کر بولا۔ "تمہاری
مرضی ماسٹر!"
اور مڑ کر پاٹل کے مکان کی طرف چلا گیا۔
جب اُس کی شبیہ تاریکی میں ڈوب گئی تب میں بھی دھیرے دھیرے ایک طرف کو چلنے لگا۔
اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ گلیوں کے کھڑنجوں پر گرم ہوا تھی۔ کھمبے پر دست بستہ بوڑھوں کی سی روشنی

کپکپاتے کھڑے تھے ۔ مکانوں کی چمنیوں اور روشندانوں سے دھواں نکل نکل کر ماحول کو گدلا کر رہا تھا۔

میں کچی سڑک پر بکھرے پتھروں سے بچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اپنے آپ میں ڈوبا، خیالوں میں گم۔

کل سویرے سورج نکلنے سے پہلے میں گاؤں چھوڑ دوں گا۔ رگھو سے رات ہی میں کہہ دوں گا۔
بہت دُکھ ہوگا اُسے ۔ نہیں اُس سے یہ نہیں کہوں گا میں اس گاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔
ورنہ رو رو کر مجھے پریشان کر دے گا۔ نہیں اب میں اس گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ اس گاؤں کی
ہر کھڑکی سے شری کانت اور دتو کے چہرے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر دیوار سے ششی کی چیخیں
سُنائی دیتی ہیں۔ ششی کی آخری چیخیں دوبارہ کانوں میں گونجنے لگیں۔ اُس کا قلم سے چھدا جسم نظروں
کے گھیرے میں چھٹپٹانے لگا۔

اُف، کیا اب اس منظر سے، اِن چیخوں سے میں کبھی پیچھا نہ چھُڑا پاؤں گا ؟

اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی ۔ میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں چونک کر رُک گیا۔ میں
ششی کے جھونپڑے کے سامنے کھڑا تھا ۔ اُس کے جھونپڑے کے سامنے ایک قندیل جل رہی تھی۔
دروازے کے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ جن پر چار پانچ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اندھیرے
میں اُن کی صرف کالی کالی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُنہیں میں کوئی ششی کا باپ مادھو بھی ہوگا۔ ششی
کے جھونپڑے کے اندر بھی ایک چھوٹا سا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ دیئے کی روشنی میں اندر بھی دو تین عورتیں
گٹھڑیاں سی بنی بیٹھی تھیں۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا چارپائی پر بیٹھے لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔
مجھے دیکھتے ہی اُن کی باتیں بند ہو گئیں۔ جب میں بالکل اُن کے قریب پہنچ کر رُک گیا تو ایک آواز آئی۔

"کون ہے ؟"

اُنہوں نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں تھا۔ میں چپ رہا۔ اُن میں سے ایک شخص اُٹھا۔ دروازے
میں ٹنگی لالٹین لے کر میرے قریب آیا۔ لالٹین کو چہرے تک اُٹھا کر میرے چہرے کی طرف حیرت سے
دیکھنے لگا۔

"کون ہے کاشیا !"

غالباً یہ سوال مادھو نے ہی پوچھا تھا۔

"شالا ماسٹر!"

"ماسٹر ـــــ" تھوڑی دیر تک سب چپ رہے۔ پھر کوئی بولا۔

"ادھر آؤ، ماسٹر ادھر آؤ ـــــ"

چارپائی پر بیٹھے سبھی لوگ کھڑے ہو گئے۔ میں نے مادھو کو پہچان لیا۔ مادھو اپنی چارپائی پر سے اُٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مادھو ـــــ بیٹھو ـــــ"

"تم بھی بیٹھو ماسٹر ـــــ"

"میں بیٹھ رہا ہوں ـــ میں بیٹھ رہا ہوں ـــ"

کہتا ہوا میں اُس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ باقی لوگ کھڑے تھے۔ مادھو بھی اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا اُس کا جسم پتنگ کی طرح کانپا۔ اور وہ پچاس ساٹھ برس کا بوڑھا شخص بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے جھک کر اُس کے لرزتے کانپتے کاندھے تھام لیے۔ مادھو تھوڑی دیر تک اُسی طرح جھک جھک کر روتا رہا۔ میں بُت بنا اُسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد مادھو اپنے کاندھے پر پڑے گمچھے سے آنکھیں اور ناک صاف کرنے کے بعد بولا۔

"کھڈس ہو گیا ماسٹر ـــ سب کچھ کھڈس ہو گیا۔"

"مادھو ـــــ" میں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر میری بزدلی نے پھر میرا گلا دبا دیا۔ اور میں کھانسنے لگا۔ کھانسنے لگا تو کھانستا ہی چلا گیا۔

"مادھو! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تین دن سے بخار ہے۔ کل سے چھٹی پر جا رہا ہوں۔ سو چا جانے سے پہلے تم سے مل لوں۔"

کاشی لالٹین کو قریب کی ایک اینٹ پر رکھے کھڑا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ہمارے سائے ہماری جسامت سے دس گُنا بڑے ہو کر جھونپڑے کی دیوار پہ لرز رہے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب ماتمی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں سب چپ چاپ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ رات کیڑوں کی کرکر اور کبھی کبھی پتوں کی سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے اندر ایک عجیب سی ندامت، ایک عجیب سی بے اطمینانی محسوس کی۔ آخر میں تھوڑی دیر بعد چارپائی سے

اُٹھنا ہو رہا ہو۔

"چلا مادھو، میں چلتا ہوں — مجھے سویرے سوا پانچ کی گاڑی سے اپنے گھر جانا ہے۔"
"اچھا ماسٹر!" مادھو نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
اتنے میں پاس ہی سے کسی بچے کے رونے کی آواز سُنائی دی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ جھونپڑے کے سامنے چھپّے کی کڑیوں سے ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ بچّے کے رونے کی آواز اُسی جھولے میں سے آرہی تھی۔ کاشیا نے ہاتھ بڑھا کر جھولے کو دو تین جھکولے دیئے بچّے کا رونا رُک گیا۔

"کاشی کا بچّہ ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔

"ہاں —" کاشیا نے جواب دیا۔

میں اُٹھ کر جھولے کے قریب گیا۔ سن کے بورے کے چاروں سروں کو چار الگ الگ رسیوں سے باندھ کر رسیوں کے چاروں سرے چھپّے کی کڑیوں میں باندھ دیئے گئے تھے۔ میں اندھیرے کے سبب بچّے کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ مگر اتنا اندازہ ہوگیا کہ ایک دس گیارہ مہینے کا تندرست بچّہ جھولے میں سویا ہوا ہے۔

میں نے جھک کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا — اور — اُسی دوران سب کی نظریں بچا کر پٹیل کا دیا ہوا پانچ ہزار روپے کا پاکٹ اُس کے پنگوڑے میں ڈال دیا۔
پھر میں تیزی سے مُڑ کر بولا۔

"اچھا — مادھو، اب میں چلتا ہوں —"
"ماسٹر آدھی پیالی چا تو پی کر جاؤ —"
"نہیں مادھو دیری ہو جائے گی — پھر کبھی — سویرے جلدی اُٹھنا ہے۔ — اچھا —"
میں مادھو اور اُس کے دوسرے ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر تیزی سے اپنے مکان کی طرف

مسافر اُس خشک پیڑ کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ جس پر کوئی پتہ نہ تھا۔ صرف ٹنڈ منڈ تین ٹہنیاں آسمان کی جانب ترشول کی مانند اُٹھی ہوئی تھیں۔ پاس ہی ایک پرانا کنواں تھا جس کی من جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کنویں پہ نظر پڑتے ہی اُس کی پیاس چمک اُٹھی۔ مگر جب اُس کی نگاہ کنویں کے چاروں طرف بکھری جنگلی خودرو جھاڑیوں پہ پڑی تو اُس کے قدم جم کر رہ گئے۔ بڑے عجیب پودے تھے۔ سفید پنکھڑیوں والے چھوٹے چھوٹے بے شمار پھول جن کی پنکھڑیوں کے درمیان سیاہ رنگ کی موسلیاں، جیسے بے شمار آنکھیں پلکیں جھپکائے بغیر اُس کی جانب گھور رہی ہوں۔ اُس نے ایک جھرجھری سی لی اور اُن جھاڑیوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اُس نے دوبارہ ترشول کی طرح اُٹھے ہوئے پیڑ کی طرف دیکھا۔ ترشول کی درمیانی نوک کے بالکل سیدھ میں ایک چھوٹی سی ٹیکری پہ ایک ٹوٹا پھوٹا سا جھونپڑا دکھائی دیا۔ وہ اپنے تھکے ہارے وجود کو دوبارہ گھسیٹتا ہوا اُس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔

جھونپڑے کے سامنے ایک صاف ستھرا چبوترہ تھا۔ ایک طرف برگد کا گھنا پیڑ تھا جس کے نیچے ایک سفید ریش سادھو آنکھیں بند کیے دھیان مگن تھا۔ اُس کے سر کی لمبی جٹاؤں سے تقریباً اُس کا سارا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ اُس کی داڑھی اُس کی ناف تک آئی تھی۔ اُس کی بھوؤں اور پلکوں کے بال تک سفید ہو چکے تھے۔

وہ تھوڑی دیر تک کھڑا اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ اُس کی آہٹ پا کر آنکھیں

کھول دے۔ اُس نے دو ایک بار زور سے کھنکارا مگر سادھو اُسی طرح دھیان مگن بیٹھا رہا۔ آخر وہ بھی تھوپڑے کے پاس ہی بنے ایک مٹی کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر اِرد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

معاً سادھو کی آواز آئی۔

"مسافر کہاں سے آرہے ہو؟"

وہ چونکا سادھو کی سفید پلکوں میں لرزش سی ہو رہی تھی۔

"میں مسافر ہوں بابا! میرا کوئی وطن نہیں۔ پیچھے ایک بستی چھوڑ آیا ہوں آگے کسی بستی میں جاؤں گا۔"

سادھو کی پیشانی پر تردد کی لکیریں کھنچ گئیں۔ اُس نے گردن جھکالی۔

"کیا بات ہے بابا! تم کچھ پریشان سے ہو گئے ہو؟"

"کون؟" سادھو نے چونک کر گردن اُٹھائی۔ "نہیں تو۔ میں کیوں پریشان ہونے لگا۔"

پھر قدرے توقف سے بولا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ ــــ تمھیں اِس طرف آنے کا راستہ کس نے بتایا؟"

"کسی نے بھی نہیں۔ میں کسی سے راستہ پوچھتا ہی نہیں بابا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ رستہ بتانے والا ہمیشہ صحیح راستہ بتائے؟"

"پر یہ بھی تو ضروری نہیں مسافر کہ تم جس رستے پر چلو وہی راستہ صحیح ہو۔"

"بابا! صحیح اور غلط رستے کی چنتا اُنھیں ہوتی ہے جنھیں کسی خاص منزل پر پہنچنا ہو۔ میری تو کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ جب تک سانس چلتا ہے چلتا رہوں گا۔ جب تھک جاؤں گا تمھاری طرح کسی برگد کے نیچے آسن جما دوں گا۔" سادھو کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ آگئی۔

"مگر میں نے یہاں تھک کر آسن نہیں لگایا ہے۔ دراصل میں کسی سفر پہ روانہ ہی نہیں ہوا، میں تو شروع ہی سے یہیں ہوں۔ اس برگد کی طرح۔"

"تو ــــ تم نے کبھی سفر نہیں کیا؟" مسافر نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں" سادھو نے اطمینان سے کہا۔ "کیا برگد بھی کہیں سفر کرتے ہیں؟"

" مگر انسان میں اور برگد میں بہت فرق ہے ۔"

" کچھ ایسا زیادہ فرق بھی نہیں ۔ انسان عمر بھر سفر کرتا ہے اور آخر تھک کر کسی برگد کی چھاؤں میں پناہ لیتا ہے ۔ ابھی خود تم نے کہا تھا کہ جب تک سانس چلتا ہے چلتا رہوں گا تھک جاؤں گا تو کسی برگد کے نیچے ـــــ کہا تھا نا ؟ "

" ہاں کہا تو تھا " مسافر کی آواز اعتراف کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی ۔

" پھر بھی " مسافر نے نئے سرے سے سنبھالا لے کر کہا ۔ " میں سمجھتا ہوں سفر بہت ضروری ہے ۔ اس سے دماغ روشن اور نظر وسیع ہوتی ہے ۔"

" پتہ نہیں اپنا اپنا تجربہ ہے ۔"

سادھو ایک دم سے خاموش ہو گیا ۔ مسافر چند لمحوں تک سادھو کے بولنے کا انتظار کرتا رہا ۔ مگر سادھو گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا ۔

" بابا ! مجھے پیاس لگی ہے ۔ اگر دو گھونٹ پانی مل جائے تو ـــ"

" تمہارے پیچھے کنواں ہے ۔ اس کنویں کا پانی بے حد ٹھنڈا اور میٹھا ہے ۔ مگر تمہیں اپنی مدد آپ کرنی ہو گی ۔ وہیں کہیں ایک ڈول بھی ہو گا ۔"

مسافر نے مڑ کر کنویں کی جانب دیکھا ۔ کنویں کی من پر ایک ڈول رکھا ہوا تھا ۔ پھر اس کی نظر کنویں کے گرد بکھری جھاڑیوں میں چھپے ان گنت آنکھوں پر پڑی جو پلکیں جھپکائے بغیر اسے گھور رہی تھیں ۔ اس نے فوراً وہاں سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور سادھو سے بولا ۔ " بابا تمہارے پاس پانی کا مٹکا یا پانی پینے کے لیے کوئی پیالہ تو ہو گا ۔"

" اس کنویں میں بارہوں مہینے پانی رہتا ہے ۔ اس لیے مجھے کبھی ان کی ضرورت نہیں پڑی ۔ جب پیاس لگتی ہے ڈول سے پانی نکالتا ہوں اور چلو سے پی لیتا ہوں ۔"

" کنویں کے گرد یہ جاگتی آنکھوں جیسے پھول بڑے عجیب لگتے ہیں ۔ جیسے وہ ہماری ایک ایک حرکت کی نگرانی کر رہے ہوں ۔ نہیں ، جیسے اپنے محبوب کے انتظار میں کسی کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں یا کسی جادو سے سارے چہرے فضا میں تحلیل ہو گئے ہوں اور صرف آنکھیں اداس آنکھیں جھاڑیوں میں الجھی رہ گئی ہوں ـــ یا ...." مسافر یک بیک رک گیا ۔

"کیا تم اُن آنکھوں سے خوف زدہ ہو؟"
سادھو کی سفید گھنی پلکیں اوپر کو اُٹھیں۔

"نہیں خوف زدہ تو نہیں۔ مگر ایک بے چینی کا احساس تو ہوتا ہے۔ اُن پر نظر پڑتے ہی لگتا ہے، کوئی ہمیں اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ اور جب اُن کی طرف سے نظریں چُرانے کی کوشش کرو تو بے شمار نرم نرم لجلجے کیڑے پورے جسم پر رینگنے لگتے ہیں۔"

"وہم ہے تمھارا۔ یہ پھول روز کھلتے ہیں اور مرجھا کر بکھر جاتے ہیں۔ پھر نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ نئے پھول کھلتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ سلسلہ کب سے جاری ہے۔ میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ اور غور کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کسی کے غور کرنے سے پھولوں کے کھلنے اور مرجھانے کے عمل میں فرق پڑنے سے تو رہا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"غلط تو نہیں۔ مگر صحیح بھی نہیں۔ سوچنا ہمارے وجود کی علامت ہے۔"

"یہ برگد، یہ پھول، یہ کنواں، یہ پتھر، یہ زمین، یہ آسمان، یہ سورج، یہ چاند، یہ تارے کیا یہ سب سوچتے ہیں۔ مگر تم ان کے وجود سے انکار تو نہیں کر سکتے۔"

مسافر نے سادھو کی بات کا جواب نہیں دیا۔ پھولوں سے نظریں چراتا کنوئیں کی من پر آیا۔ ڈول پانی میں پھینکا، کنواں بہت گہرا تھا۔ اوپر سے اُس کی تہہ میں پانی یوں چمک رہا تھا جیسے نیچے بہت نیچے چاندی کا سکہ پڑا چمک رہا ہو۔ اُس نے ڈول اوپر کھینچا۔ پانی واقعی بے حد ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اُس نے جی بھر کر پانی پیا۔ پھر آستین سے منہ پونچھتا ہوا دوبارہ مٹی کے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔

"پی چکے پانی ــــ"

"ہاں واقعی پانی بے حد ٹھنڈا اور میٹھا ہے، سفر کی ساری تھکان ختم ہو گئی۔"

سادھو ہنس دیا۔

"مگر اب تھوڑی ہی دیر میں تمھیں ایسی کڑاکے کی بھوک لگے گی کہ تم تڑپ جاؤ گے۔"

"بابا جب تمھیں بھوک لگتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟" بھوک کا نام لیتے ہی پیچ مسافر کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

بند تھیں اور سڑک دور تک ۔ ۔ پڑی تھی ۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ۔ کہیں بہت قریب سے عورتوں کے بین کرنے اور بچوں کے مسلسل رونے کی دبی دبی آواز آ رہی تھی ۔ اُس نے متجسسانہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا پر کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا ۔ غور کرنے پر اُسے لگا کہ آواز بند مکانوں سے آ رہی ہے ۔ جیسے بہت سے لوگ اپنی سسکیاں دبانے کی کوشش کر رہے ہوں ۔ مگر رہ رہ کر ایک آدھ سسکی کسی نہ کسی کے ہونٹوں سے پھسل ہی جاتی تھی ۔

اُس نے رک کر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا ۔ کچھ سوچ کر ایک مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہوا ۔ رونے اور سسکنے کی آواز مکان کے اندر سے برابر آ رہی تھی ۔ وہ چند لمحے تک کچھ سوچتا رہا اور پھر دروازے پر ہلکے ہلکے دستک دینے لگا ۔ دستک کی آواز پر یک بیک مکان کے اندر سناٹا چھا گیا ۔ تھوڑے توقف کے بعد اُس نے دوبارہ دروازے پر دستک دی مگر سناٹا بدستور قائم رہا ۔ تیسری بار دستک دینے پر بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو وہ مایوس ہو کر سڑک پر آ گیا ۔ اب بستی کی ویرانی سے اُسے ہول سا ہونے لگا ۔ شدید بھوک سے اُس کی آنتیں اینٹھنے لگی تھیں ۔ اُسے لگا اگر وہ تھوڑی دیر تک یوں ہی چلتا رہا تو غش کھا کر گر پڑے گا ۔

اتنے میں دور ایک بڑے سے میدان میں اُسے انسانی ہیولوں کا ایک جمگھٹ سا دکھائی دیا ۔ اُس کے قدم بے اختیار اُدھر کو اُٹھ گئے ۔ جب وہ قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ بے شمار سوکھے مریل لوگ ایک اونچے چبوترے کے سامنے قطار لگائے کھڑے ہیں ۔ چبوترے پر ایک ترش رو توندیل شخص ایک دمچی کرسی پر بیٹھا تھا ۔ اُس کے سامنے گیہوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا تھا اور اُس کے دائیں طرف ایک شخص ہاتھ میں ترازو لیے کھڑا تھا اور بائیں طرف ایک دراز قد شخص اپنے چہرے کو سیاہ نقاب میں چھپائے ہاتھ میں چمکتی تلوار لیے چاق و چوبند کھڑا تھا ۔ کچھ گھڑسوار سپاہی سیاہ گھوڑوں پر سوار اپنے لمبے لمبے چابک لہراتے ادھر سے اُدھر گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے ۔ مسافر قطار میں کھڑے سب سے آخری شخص کے پاس گیا ۔

"بھائی مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے ۔ یہاں کوئی ہوٹل یا سرائے ہو تو بتاؤ ۔"

وہ شخص چونک کر مڑا اُسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور پوچھا ۔

"اجنبی ہو ؟"

جی ہاں۔ مسافر ہوں۔ زندگی سے جوجھ رہا ہوں اگر کہیں سے کچھ کھانے کو مل جاتا تو ــــ !"

ہم سب بھوکے ہیں اور یہاں اناج لینے کھڑے ہیں۔ تم بھی قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ چند مٹھی اناج تمہیں بھی مل جائے گا ....."

مگر قطار تو بہت لمبی ہے۔ پتہ نہیں کب نمبر لگے۔ مجھے کسی ہوٹل کا پتہ بتا دو میں وہیں سے کھانا خرید لوں گا۔"

"اوّل تو یہاں کوئی ہوٹل نہیں۔ دوسرے یہاں کھانا خریدا نہیں جاتا۔"

"میرے پاس چند سونے کے سکّے ہیں۔"

"یہاں سونے کے سکوں کا چلن نہیں ہے۔"

"تب ـــ" مسافر نے استفہامیہ نظروں سے اُس شخص کی طرف دیکھا۔

"تھوڑی دیر میں تم خود دیکھ لو گے۔ وہ دیکھو غلّے کی تقسیم شروع ہو گئی ہے۔ اگر غلّہ لینا ہے تو قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔"

اُس شخص نے مسافر کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔

قطار کا پہلا شخص لڑکھڑاتا، کانپتا آگے بڑھا۔ چبوترے پر بیٹھے ترش رو قوی ہیکل شخص نے اپنے بائیں طرف کھڑے دراز قد نقاب پوش کو اشارہ کیا۔ نقاب پوش ایک قدم آگے بڑھا۔ مریل شخص نے اپنا بایاں ہاتھ پھیلا دیا۔ نقاب پوش کی تلوار چمکی اور دوسرے ہی لمحے مریل شخص کا ہاتھ کہنی سمیت کٹ کر دور جا گرا اور مریل شخص کے ہاتھ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ مسافر لرز گیا۔ مگر اُسے حیرت ہوئی کہ مریل شخص کے ہونٹوں سے ایک سسکاری تک نہیں نکلی۔ بلکہ اُس نے چپ چاپ جھک کر اپنے کٹے ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے اُٹھا لیا اور وہ ہاتھ ترازو بردار کی طرف بڑھا دیا۔ ترازو بردار نے اُس ہاتھ کو ترازو کے بائیں پلڑے پر رکھا اور اناج کے ڈھیر سے چند مٹھی اناج ترازو کے دائیں پلڑے میں ڈال کر تولنے لگا۔ دست بریدہ شخص نے دائیں ہاتھ میں ایک جھولا پکڑے خالی خالی نظروں سے ترازو بردار کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں اُن چشم آسا پتھروں سے مشابہ تھیں جنہیں مسافر نے سادھو کی کُٹیا کے پاس دیکھا تھا۔ ترازو بردار نے اناج تول کر اُس شخص کے جھولے میں ڈال دیا اور اُس کا کٹا ہوا ہاتھ اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ دست بریدہ شخص جھولا کاندھے سے لٹکائے

لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف کو چل دیا۔

اُس کے بعد قطار سے دوسرا مریل شخص آگے بڑھا۔ نقاب پوش نے ایک بار پھر بجلی خون آشام تلوار سر سے بلند کی، اور اُس کا بھی بایاں ہاتھ قلم کر دیا۔ ترازو بردار نے اُس کی جھولی میں تلی کٹے ہاتھ کے برابر اناج تول کر ڈال دیا۔

مسافر کے لیے یہ ہیبت ناک منظر ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اُس نے اپنے آگے کھڑے شخص سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"یہ ــــ یہ ہاتھ کیوں قلم کرتے ہیں؟"

"یہاں دو مٹھی اناج کی یہی قیمت ہے۔"

"او میرے خدا ــــ دو مٹھی اناج کے بدلے ہاتھ ــــ اُف ــــ پورا ہاتھ کٹ جاتا ہے مگر کوئی اُف تک نہیں کرتا۔"

"عادی ہو گئے ہیں، ہم روز اپنا ہاتھ کٹاتے ہیں اور روز راتوں رات نیا ہاتھ اُگ آتا ہے۔ دوسرے دن پھر کٹاتے ہیں، رات کو پھر اُگ آتا ہے۔"

"اور کسی رات ہاتھ نہ اُگیں تب؟"

"میری یادداشت کے مطابق آج تک تو ایسا نہیں ہوا۔ اگر ہاتھ نہ اُگے تو ہم کٹائیں گے کیا؟ سے اُگتا ہی ہے۔ ہاں رات میں کوئی مر جائے تو بات دوسری ہے۔"

"یہ سلسلہ کب سے جاری ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، اپنا ہاتھ کٹواتا آیا ہوں۔ مجھ سے پہلے میرے باپ بھی ہاتھ کٹواتے تھے اور دو مٹھی اناج سے ہمارا جہنم بھرتے تھے۔ باپ سے پہلے دادا ــــ اور دادا سے پہلے ــــ جانے کب سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ نہ جانے کب تک یہی سب ہوتا رہے گا۔"

"اگر کوئی اپنا ہاتھ کٹانے سے انکار کر دے تو؟"

"بھوکوں مرے گا۔"

"تم میں سے کوئی اس ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کرتا؟"

کبھی کبھی کوئی شامت کا مارا آواز بلند کرتا ہے۔ مگر اس احتجاج کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے اُسے ۔ اُن گھڑ سواروں کو دیکھ رہے ہو۔"

اس نے مُڑ کر اُن گھڑ سواروں کی طرف دیکھا جو ہاتھوں میں چابک لیے قطار میں کھڑے لوگوں کو بار بار قطار سیدھی رکھنے کی ہدایت کر رہے تھے۔

وہ شخص کہہ رہا تھا۔ "احتجاج کرنے والوں کے دونوں ہاتھ گھڑ سواروں کی رکابوں سے باندھ دیے جاتے ہیں اور گھڑ سوار اپنے گھوڑوں کو مخالف سمتوں میں موڑ کر ایڑ لگا دیتے ہیں۔ چشمِ زدن میں احتجاج کرنے والے کے دونوں ہاتھ اُس کے جسم سے اکھڑ کر گھوڑوں کی رکابوں سے جھول جاتے ہیں اور دست بریدہ بدن خاک و خون میں تڑپتا رہ جاتا ہے۔"

مسافر کانپ گیا۔ وہ شخص یک بیک چپ ہو گیا۔

ایک گھڑ سوار اُس شخص کی طرف آ رہا تھا۔ گھڑ سوار اُن کے قریب سے چابک ہراتا ہوا آگے نکل گیا۔ مسافر سکتے کے سے عالم میں کھڑا تھا۔ قطار آگے کو رینگ رہی تھی۔ اب اُس کے پیچھے بھی کافی لوگ آ آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اُس کے پیچھے کھڑے شخص نے اُسے ٹھوکا دیا۔

"بھائی آگے سرکو۔"

اُس نے چونک کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اُسے لگا، اچانک کسی نے اُس کے پیروں کی ساری قوت سلب کر لی ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا قطار سے نکل آیا۔ پاس پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے لوگوں کے ہاتھ قلم ہوتے دیکھتا رہا۔ رہ رہ کر نقاب پوش کی تلوار چمکتی، ہاتھ قلم ہوتا، اور ہاتھ کے بدلے دست بریدہ شخص کی ہتھیلی میں دو مٹھی اناج ڈال دیا جاتا۔ قطار میں کھڑے لوگ ویران آنکھوں سے یہ خوں چکاں منظر دیکھتے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

مسافر اس منظر کو دیکھنے میں اب سویا تھا کہ اسے اپنے ارد گرد کا مطلق ہوش نہ رہا۔ چابک گھوڑے کی ہنہناہٹ پر وہ چونکا۔ ایک گھڑ سوار بالکل اُس کے سر پر کھڑا تھا۔ اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔ گھڑ سوار خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھور رہا تھا۔

"تم قطار سے باہر کیوں کھڑے ہو؟"

"میں ـــــ میں اس بستی کا رہنے والا نہیں ہوں۔ ــ میں مسافر ہوں۔"

سپاہی نے چابک لہرایا ــــ "اُدھر ــــ اُس طرف چلو۔"

مسافر نے اُدھر قدم بڑھایا جدھر گھڑسوار نے اشارہ کیا تھا۔ گھڑسوار اُسے ہانکتا ہوا اُس ترش رو شخص کے روبرو لے جاکر کھڑا کر دیا۔

" ترش رو شخص نے گھڑسوار کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

" اجنبی۔" گھڑسوار نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" ہُم ــــ" ترش رو شخص نے اُس کی طرف دیکھا۔

" کہاں سے آرہے ہو؟"

" مسافر نے لجاجت سے کہا ــ میں مسافر ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں۔ بھوک لگی تھی اس لیے اس طرف نکل آیا تھا۔"

" بھوک لگی ہے تو قطار میں کھڑے رہ کر اپنی باری کا انتظار کرو۔"

" مگر ــــ مگر ــــ میں اپنا ہاتھ کٹوانا نہیں چاہتا۔

" خاموش ــــ" ترش رو چیخ پڑا۔ اُس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر تک اُسی طرح غصے میں پیچ و تاب کھاتا رہا پھر بادل کی طرح گرجا۔

" جانتے ہو، یہاں انکار کی سزا موت ہے۔"

" م ــــ م ــــ مجھے علم ہے۔"

" تم اجنبی ہو اس لیے تمھیں صرف اتنی رعایت دی جاسکتی ہے کہ تم اسی وقت بستی سے نکل جاؤ۔"

پھر وہ گھڑسوار سے مخاطب ہوا۔" جاؤ اسے بستی سے باہر چھوڑ آؤ۔"

سپاہی اُسے ہانکتا ہوا بستی سے باہر لے آیا۔

" اب مڑ کر دیکھے بغیر دوڑ لگاؤ۔ اگر تم نے ایک بار بھی مُڑ کر دیکھا تو میرا تیر تمھاری پُشت میں پیوست ہو جائے گا۔" اُس نے کمان سیدھی کرتے ہوئے ترکش سے تیر نکال لیا۔ مسافر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ناک کی سیدھ میں دوڑنے لگا۔

دوڑتے دوڑتے اُس کا سانس پھول گیا مگر اُس کے قدم ذرا سست نہیں پڑے۔ اُس کے کانوں میں ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی اور گلا خشک ہو گیا تھا۔ مگر وہ دوڑتا رہا۔

جلد ہی وہ ٹیکری کے قریب پہنچ گیا۔ اندازے کے مطابق اب وہ تیر کی زد سے نکل آیا تھا۔ مگر احتیاطاً اُس نے مڑکر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ٹیکری پر چڑھنے لگا۔ اب وہ تھک کر چور ہوگیا تھا۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہوگیا تھا آخر وہ ٹیکری کے سرے پر پہنچ گیا۔ یہاں سے سادھو کی جھونپڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے مڑکر بستی کی طرف دیکھا۔

ٹیکری پر سے وہ بستی کسی قبرستان کی طرح خاموش نظر آ رہی تھی۔ وہ چند مکانات مقبروں کی مانند ٹھہ سرار دکھائی دے رہے تھے۔ گھڑسوار کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ وہ چند لمحوں تک پھولی سانسوں کے ساتھ بستی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مرے قدموں سے سادھو کی جھونپڑی کی سمت چل پڑا

جب وہ ٹیکری پار کر کے واپس سادھو کی جھونپڑی کے پاس آیا تو اُس کا سارا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ اور تھکن اُس کی نس نس میں سرایت کر چکی تھی۔

سادھو نے پُرسکون آواز میں پوچھا

"مسافر واپس آگئے ؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مٹی کے چبوترے پر بیٹھ کر کسی چوپائے کی طرح زبان نکالے ہانپتا رہا۔ سادھو نے بھی اُس سے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھا سستاتا رہا پھر اپنی آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا اپنے آپ بڑبڑانے لگا۔

"بڑی عجیب بستی ہے۔ دو مٹھی اناج کے بدلے بایاں ہاتھ ___ تعجب ہے لوگ چپ چاپ اپنا ہاتھ کٹوا لیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ کمال ہے۔"

کیا کر سکتے ہیں۔ بھوک بڑی کمینی چیز ہے۔"

سادھو کی آواز پھر سنائی دی۔

"مگر دو مٹھی اناج کی اتنی بڑی قیمت ؟"

"یہاں عرصے سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اس لیے بستی کے لوگوں کو اب جو کچھ نے پر حیرت ہوتی ہے نہ صدمہ ___"

مسافر نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خلا میں گھورتا کسی گہری سوچ میں غرق ہوگیا تھا۔ اب اُس کی بھوک کی شدت بھی کم ہوگئی تھی بلکہ حقیقتاً اُس کی بھوک ہی مر گئی تھی۔

وہ دونوں ہتھیلیوں سے سر تھامے گردن نیوڑھائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اب اُس کی سانس کی رفتار بھی معمول پر آچکی تھی۔ سانس کے معمول پر آتے ہی اُسے پھر بھوک کا ہلکا ہلکا احساس ہونے لگا۔ اُس نے گردن اُٹھا کر اپنے ارد گرد نظر ڈالی کہ شاید کسی درخت پر کوئی پھل نظر آجائے، اور وہ ایک آدھ پھل کھا کر اپنی بھوک مٹا سکے۔ مگر نزدیک اور دور کوئی ثمر آور درخت نہیں تھا۔ چاروں طرف خشک بے ثمر درخت بانہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ یا پھر اِدھر اُدھر بے تحاشا بکھری ہوئی خود رو جھاڑیاں تھیں جن میں وہ بے ثمر آسا بھول بے وجہ دل میں خلش پیدا کر رہے تھے۔

سورج اب تیزی سے مغرب کی سمت جھک رہا تھا۔ اور شفق کے سُرخ دیو نے آسمان کو چاٹنا شروع کر دیا تھا۔

معاً سادھو کی آواز آئی۔ "اچھا مسافر تم یہاں بیٹھو میں بھکشا لے کر آتا ہوں۔"

"بھکشا؟" مسافر نے چونک کر سادھو کی طرف دیکھا۔

"ہاں، میری بھکشا کا سمے ہو گیا ہے۔"

"تو کیا تم بھکشا کے لیے اُسی بستی میں جاؤ گے؟"

"ہاں۔"

"تمہارا بایاں ہاتھ ــــ" اُس نے سہم کر سادھو کے بائیں ہاتھ کی جانب دیکھا۔ مگر سادھو کا بایاں ہاتھ سلامت تھا۔

"نہیں ــــ" سادھو ہنس دیا۔

"مجھے ہاتھ کٹانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"کیوں؟"

مسافر تم نے شاید غور نہیں کیا۔ میں اندھا ہوں، مادر زاد اندھا۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

تب اُس نے پہلی بار سادھو کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ سچ مچ اُس کی آنکھوں کے شیشے غبار آلود تھے اور اُن کے عقب میں لامتناہی صحرا پھیلا ہوا تھا۔

"اب میں چلتا ہوں۔ سورج ڈوبنے سے پہلے مجھے بستی سے واپس [illegible] آنا چاہیئے۔ ورنہ میرے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

سادھو لاٹھی ٹیک کر اُٹھا۔ پھر خلا میں دیکھتا ہوا اپنی لاٹھی سے کھٹ کھٹ کرتا بستی کی سمت چل پڑا۔

مسافر خالی آنکھوں سے سادھو کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس کی بھوک دوبارہ پوری شدت سے چمک اُٹھی تھی۔ ○○

کام دھینو

۵۹ مارچ کی ایک صاف و شفاف صبح تھی۔ اور سورج پہاڑی کے پیچھے سے یوں طلوع ہو رہا تھا جیسے کوئی نٹ کھٹ بالک کسی نئی شرارت کی فکر میں دیوار کی اوٹ سے جھانک رہا ہو۔ صبح کی ہوا کے لطیف اور خوش گوار جھونکے جوار کی پکی فصل کو ہولے ہولے چھیڑتے گزر رہے تھے۔ جیسے ماں نے بچے کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر رہی ہو۔ فضا میں جوار کی مہک بسی ہوئی تھی اور درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ نصرت پور کی اکلوتی بڑی سڑک اور گلیاں تقریباً سنسان تھیں۔ ہاں گھروں کے آنگنوں سے مویشیوں کے ڈکرانے اور بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی گھر سے ایک آدھ بچے کی چیخ کر رونے کی آواز بھی آ جاتی۔ ایک بنیا اپنی دکان کا ایک پٹ کھولے دکان کی چوکھٹ پر بیٹھا داتون کر رہا تھا۔ دو گوالے سروں پر دودھ کی گاگریں رکھے سپ سپ جھپ جھپ گزر رہے تھے۔ سامنے سے ایک گوالا سائیکل پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس کی سائیکل کے ہینڈل سے دودھ کی خالی کینیں لٹکی ہوئی تھیں جو سائیکل کے ہچکولوں سے ٹکرا کر عجیب سی کھڑ کھڑ کر رہی تھیں۔

تبھی نصرت پور میں ایک جیپ گاڑی داخل ہوئی۔ جیپ گاڑی کی باڈی پر چاروں طرف سے بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے جن پر جلی حروف میں مختلف نعرے لکھے تھے اور ہر بینر پر سورج کا نشان بنا ہوا تھا۔ جیپ گاڑی کے دائیں بائیں پارٹی کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ پیچھے دو بڑے بڑے لاؤڈ سپیکر فٹ تھے۔ جیپ گاڑی میں چار پانچ نوجوان بیٹھے تھے۔ جیپ گاڑی

دھول اُڑاتی سڑک پر آگئی۔ اور اُسی وقت جھونپو سے آواز آئی۔

"بھرت پور کے باسیو! جاگو غفلت سے جاگو — ابھی نہیں جاگے تو کبھی نہیں جاگو گے۔ دیکھو رات بیت گئی۔ اندھیرا چھٹ گیا۔ ناانصافی، نابرابری، بھوک اور بے کاری کا اندھیرا — نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ یاد رکھو سورج صرف اونچی عمارتوں اور محل دومحلوں کو روشن نہیں کرتا۔ وہ جھونپڑوں، جھگیوں میں بھی اپنا نور بکھیرتا ہے۔ یہ سورج تمھاری خوش حالی اور مسرتوں کا ضامن ہے۔ یاد رکھو سورج کا نت ہے — جاگ اُٹھا ہندوستان — جاگو تم بھی جاگو اور اپنے محبوب لیڈر الحاج مرزا تُراب علی کو ووٹ دو۔"

"مرزا تُراب علی — زندہ باد —"

بھونپو کی آواز سے سب سے پہلے تو بوڑھے ہی اپنی اونگھ سے جاگے۔ پھر جوان آنکھیں مَلتے ہوئے اُٹھے۔ بلکہ بعض کو اُن کی بیویوں، ماؤوں اور بہنوں نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا۔ سب اپنے اپنے بستروں سے اُٹھ بیٹھے، دروازے وا ہونے لگے۔ لوگ دروازے کھول کھول کر دالانوں جیوتروں، گلیوں اور سیڑھیوں پر آ آکر کھڑے ہو گئے۔ کھڑکیوں کے پٹ کھُلے اور عورتیں گردنیں نکال نکال کر جھانکنے لگیں۔ بچّے ماؤوں کے کاندھوں کے اوپر سے اور باپوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل نکل کر اپنی کیچ بھری آنکھوں کو ملتے، بہتی ناکوں کو اُلٹی ہتھیلیوں سے پونچھتے کچھ تجسّس، کچھ استعجاب، کچھ خوف، کچھ اضطراب کی کیفیت میں اِدھر اُدھر تاکنے لگے۔ بوڑھے آنکھوں پر اپنی لرزتی ہتھیلیوں کا چھجّا بنائے، اور نوجوان پیشانیوں پر بل ڈالے اُس طرف نہارنے لگے جدھر سے بھونپو کی آواز آرہی تھی۔ جیپ گاڑی بھرت پور کی بڑی سڑک پر دھول اُڑاتی آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ جیپ کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ جیپ کے جھونپو سے اعلان نشر ہو رہا تھا۔

"صاحبو! آئیے، گرام پنچایت کے میدان میں ہمارے قوم ... تُراب علی بنفسِ نفیس آپ سے خطاب کرنے تشریف لارہے ہیں۔"

ایک بوڑھے نے اپنی کیچ بھری آنکھیں مچمچاتے دوسرے بوڑھے سے پوچھا

"یہ مرزا تُراب علی کون صاحب ہیں؟"

"کوئی نیتا لگت ہیں" دوسرے کا جواب

نیتا؟ ہمارے زمانے میں تو گاندھی جی، جواہر لال، مولانا آزاد جیسے لوگ نیتا ہوتے تھے۔
یہ کیسے نیتا ہیں بھیا؟"

"یہ نئے زمانے کے نیتا ہیں چاچا!" ایک نوجوان نے —

"کتاب کرنے آرہے ہیں۔ کیا مطلب؟"

"کتاب نہیں — خطاب۔"

بھرت پور کے اکلوتے کالج، کیرتی مہاودیالیہ کے لیکچرر بولے جو کالج میں اردو پڑھاتے تھے۔

"ہاں — ہاں، وہی کتاب کرنے آرہے ہیں۔ مطلب کیا کرنے آرہے ہیں؟"

"بھاشن دینے آرہے ہیں۔"

"اچھا — بھاشن دینے — ہم سمجھے — کتاب مانے کوئی پاٹھ واٹھ کرنے آرہے ہیں۔"

"پاٹھ تو پنڈت لوگ کرتے ہیں کاکا — نیتا لوگ بھاشن دیتے ہیں۔"

"ہاں — ہاں معلوم ہے —" کاکا کو نوجوان لیکچرار کی غلطی ناگوار لگی۔

گرام پنچایت کے اکلوتے میدان میں ایک بڑا سا چوکور سرکاری چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر ایک چھت بھی پڑی ہوئی تھی۔ اکثر رام لیلا کے ناٹک اور نوٹنکیاں وغیرہ اسی چبوترے پر کھیلے جاتے۔ ہولی کے موقع پر میدان میں بڑا سا گڈھا کھود کر اس میں آگ روشن کی جاتی اور 'ہولیکا' کو جلایا جاتا۔ گنپتی کے موقع پر یہاں ایک بہت بڑا گنپتی بھی بٹھایا جاتا۔ محرم میں اسی چبوترے سے تعزیے بھی اٹھتے اور انھیں یہیں لا کر ٹھنڈا کیا جاتا۔ عید میلاد کا جلوس بھی اسی میدان سے نکلتا تھا۔ اور اگر کوئی چھوٹا موٹا منتری یا نیتا اس گاؤں سے گزرتا تو اس کے اعزاز میں اسی میدان میں جلسہ منعقد ہوتا اور وہ منتری یا نیتا [illegible] سے گاؤں والوں کو خطاب کرتا۔ بھرت پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں ہندو مسلم کی ملی جلی آبادی تھی۔ مگر پیشے کے اعتبار سے اکثریت گواروں کی تھی جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ دس پندرہ کرسچنوں کے بھی گھر تھے اور ان کا ایک مختصر سا چرچ بھی تھا جہاں وہ اپنی اتوار کی عبادت کر لیا کرتے تھے۔

بھرت پور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہاں آج تک کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔ ملک میں آئے

نت ہونے والے فسادات کی خبریں یہاں بھی پہنچتیں۔ ٹی۔وی اور ریڈیو سے خبریں نشر ہوتیں مگر ہنسپور کے لوگوں پر ان فسادات کی خبروں کا کوئی خاص ردِ عمل نہ ہوتا۔ بیچارے اپنے مویشیوں اور کھیتی باڑی میں ایسے منہمک رہتے کہ انھیں ان خرافات کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملتی۔

ایسا نہیں تھا کہ ہنسپور میں جھگڑے فساد نہیں ہوتے تھے۔ یہ جھگڑے زیادہ تر روزمرہ کی معمولی باتوں پر ہوتے اور بڑے بزرگوں کے بیچ بچاؤ یا سمجھانے کے کہنے پر فوراً ختم بھی ہو جاتے۔ ان میں مذہب، سیاست کی بربریت اور شدت پسندی نہ ہوتی۔ دو ایک دفعہ مذہبی معاملوں پر بھی گرما گرمی ہوئی تھی مگر گاؤں والوں نے خود ہی مل ملا کر اُسے طے کر لیا تھا۔

سورج آسمان پر کئی گز اوپر آ چکا تھا۔ لوگ ایک ایک دو دو کر کے گرام پنچایت کے میدان میں جمع ہونے لگے۔ میدان کے چبوترے کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور پتاکوں سے سجا دیا گیا تھا۔ چبوترے پر چار پانچ کرسیاں اور ایک میز بھی رکھ دی گئی تھی میز پر غلاف بچھا تھا اور اُس پر ایک گلدان رکھا تھا۔ لوگ میدان میں آ آ کر چبوترے کے سامنے بیٹھتے جا رہے تھے۔ جن میں بوڑھے اور جوان بھی شامل تھے۔ کچھ نو عمر لڑکے میدان میں اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ایک طرف بزرگوں کے درمیان چلم بھی چل رہی تھی۔ نوجوان ایک دوسرے کو کہنیوں سے ٹھوکے دیتے کسی بات پر رہ رہ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ تبھی میدان میں ایک طرف وہی صبح والی جیپ آ کر کھڑی ہو گئی جو صبح بار بار نواب علی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ جیپ کے پیچھے تین چار کاریں بھی تھیں۔ کاروں کے دروازے کھُلے اور چند کُرتے پاجامے پہنے موٹے تازے لوگ باہر نکلے جو لباس کے اعتبار سے سنجیدہ لگتے تھے مگر جانے کیوں اُن کے کرخت چہرے اُن کے لباس سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ سب خراماں خراماں چبوترے کی طرف بڑھے۔ سب سے آگے نواب علی چل رہے تھے جو کاٹن شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ زیب تن کیے ہوئے تھے اور جن کے سر پر فر کی کٹوری ٹوپی تھی۔ چبوترے پر کھڑے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا اور اُنھیں چبوترے پر بچھی کرسیوں پر بیٹھا دیا۔ نواب علی کی کرسی سب سے اونچی تھی۔ ایک نوجوان نے مختصر طور پر مہمانوں کا تعارف کرایا۔ جلسے کی غرض و غایت بتائی۔ اور ایک چھوٹی موٹی تقریر کے بعد ہی نواب علی کے نام کا اعلان ہوا۔

میں شامل کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں میں آپ کے سامنے اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر یہ ثابت کر دوں گا کہ میں گوالا نہیں ہوں مگر گوالوں سے الگ بھی نہیں ہوں۔"

ایک بار پھر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے میدان گونج اُٹھا۔ تُراب علی کہہ رہے تھے۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس مبارک کام کے لیے بیسیوں حضرات اپنی اپنی گائیں، بھینسیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس مرحلے میں بھی میرا نبیؐ میری رہنمائی کرے گا۔ یاد کیجیے خدا کے رسولؐ جب مکّہ سے ہجرت کر کے مدینے پہنچے تھے تب مدینے کا ہر شخص اُنہیں اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا مگر آپ نے اعلان کیا تھا کہ ——

"ہماری اونٹنی جس مکان کے سامنے ٹھہرے گی ہم اُس کے گھر مہمان ہوں گے۔"

اور آپؐ کی اونٹنی شہر کے آخر میں ایک غریب انصاری کے گھر کے سامنے رُکی تھی اور آپؐ اُسی صحابی کے مہمان ہوئے تھے —— ہم بھی حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور گاؤں کے آخر میں جس گوالے کا گھر پڑے گا اُسی کے آنگن میں دودھ دوہ کر خود کو آپ کی برادری کا ایک رُکن بنا لیں گے۔"

ایک بار پھر "تُراب علی زندہ باد" کا نعرہ لگا۔

تُراب علی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

جلسہ ختم ہوا۔ تُراب علی چبوترے سے نیچے اُترے۔ پارٹی کے رضاکاروں نے اُنہیں گھیر لیا۔ اُن کے گلے میں اُن کی ناک تک پھولوں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ تُراب علی دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو نمسکار کرتے اور سب کے نمسکار قبول کرتے ایک طرف چلنے لگے۔ لوگ بھی ایک جلوس کی شکل میں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ہر دس بارہ قدم پر پارٹی کے رضاکار "تُراب علی زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس گاؤں کی اکلوتی بڑی سڑک سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھڑے متجسس نگاہوں سے جلوس کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں کھڑکیوں اور نیم وا دروازوں کے پیچھے حیرت اور دلچسپی سے جلوس کا نظارہ کر رہی تھیں۔ تُراب علی سب کے آگے دونوں ہاتھ جوڑے سر پا نمسکار بنے چل رہے تھے۔ سب کو یہی فکر تھی کہ دیکھیں تُراب علی کس کے گھر جا کر دودھ دوہتے ہیں۔

کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے۔ ہجوم نے اُنھیں اور گائے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ رضا کاروں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر ایک حلقہ سا بنایا اور ہجوم کو آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ لوگ ایک دوسرے کے کاندھوں پر سے اچھل اچھل کر تراب علی کو دودھ دوہتا دیکھ رہے تھے۔ بعض لڑکے آس پاس کے درختوں پر چڑھ کر نظارہ کرنے لگے۔ تراب علی نے لوٹے میں پانی لیا پہلے اپنے ہاتھ دھوئے، پھر گائے کے تھنوں پر پانی ٹپکایا۔ گائے ذرا کسمسائی۔ مگر تراب علی نے پچکار کر اُسے شانت کیا۔ پیتل کی کلسی کو اُس کی ٹانگوں کے نیچے رکھا اور کسی مشّاق گوالے کی طرح دونوں ہاتھوں سے اُس کے تھن سہلانے لگے۔ لوگ سانسیں روکے کھڑے تھے۔ سہلاتے سہلاتے تراب علی نے دفعتاً دونوں مٹھیاں کس کر جو زور سے کھینچیں تو "چرّر" کی آواز کے ساتھ سانپ کی زبان کی طرح پتلی مگر چمکیلی ہوئی چاندی جیسی سفید دودھ کی دھار پیتل کی کلسی میں گری۔ کئی لوگوں کی زبان سے بے ساختہ "واہ" نکلی۔ مجمع میں جیسے حیرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

تراب علی "چرچر — چرچر —" دودھ دوہ رہے تھے اور چاروں طرف سے عزت و تحسین کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ مادھو یہ سب دیکھ رہا تھا وہ کہنا چاہتا تھا۔ "بس کرو بھائی، میری گیّاں ابھی بیائی ہے بچھڑے کے لیے بھی تو کچھ دودھ رہنے دو۔" مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ کھڑا حیران آنکھوں سے تراب علی کو دودھ دوہتا دیکھتا رہا۔ جب کلسی تقریباً ایک تہائی بھر گئی تب تراب علی اپنے ہاتھ دھوتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک رضا کار نے آگے بڑھ کر تولیہ پیش کیا۔ تراب علی تولیہ سے ہاتھ خشک کرتے مادھو کی طرف مڑے۔

"بھائی مادھو! ہم تمھارے بہت شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی گیّاں کا دودھ دوہنے کا موقع فراہم کیا۔ تمھاری اس کشادہ دلی کا ذکر ہم ودھان سبھا میں بھی کریں گے اور تمھیں زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

پھر وہ مجمع کی جانب مڑ کر گویا ہوئے۔

"بھائیو! اب تو آپ لوگوں کو یقین ہو گیا نا کہ تراب علی آپ کا اپنا بندہ ہے۔"

بیشتر لوگ تو چپ رہے مگر پارٹی کے رضا کار "جی ہاں، جی ہاں" کہتے ہوئے گردنیں ہلانے لگے۔ رضا کاروں نے مجمع کو ہٹا کر تراب علی کے لیے راستہ بنایا۔ اور تراب علی تیز تیز چلتے ہوئے اپنی کار میں

جا کر بیٹھ گئے۔ پارٹی کے دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ان کاروں کا یہ قافلہ
تُراب علی زندہ باد کے نعروں کی گونج میں دھول اڑاتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ گاؤں کے بچے شور
مچاتے تھوڑی دور تک کاروں کے پیچھے بھاگے مگر کاریں جلد ہی دور نکل گئیں۔ سب لوگ اپنے اپنے
گھروں کو لوٹنے لگے۔ مادھو اپنی گائے کے پاس کھڑا اُس غبار کی جانب دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے
تُراب علی اور اُن کی کاروں کا قافلہ روپوش ہو گیا تھا۔ گائے اپنی دُم سے مکھیاں اُڑاتی، گھوتیاں
ہلاتی دھیرے دھیرے جگالی کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی تھی اور اُس کے
پیروں کے پاس وہ پیتل کی کلسی اوندھی پڑی تھی جس میں ابھی ابھی تُراب علی نے دودھ دوہا تھا۔ کلسی
کا دودھ فرش پر بہہ کر مٹی میں جذب ہو چکا تھا اور آس پاس مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مادھو دھیرے
دھیرے چلتا ہوا گائے کے پاس آیا پیار سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ گائے نے ایک جھرجھری
سی لی۔ مادھو دوبارہ اپنے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ مادھو کی گھروالی جو ابھی تک دروازے کی اوٹ
سے سارا تماشا دیکھ رہی تھی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اُس کی گود میں اُن کا تین سال کا کالا کلوٹا مریل
سا بچہ تھا۔ جس کے ہاتھ پاؤں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے مگر پیٹ ڈھول پر مڑھے چمڑے کی مانند
تنا ہوا تھا۔ بچہ متواتر ریں ریں کیے جا رہا تھا۔ بیوی نے مادھو سے پوچھا۔

"کون تھے یہ لوگ؟"

"مالوم نہیں ــــ" مادھو نے جیب سے بیڑی نکالی۔

"اُنہوں نے اپنی گیّاں کا دودھ کیوں دوہا ــــ؟"

"مالوم نہیں ــــ" مادھو نے بیڑی ہونٹوں میں دبائی۔

تم نے پوچھا نہیں؟"

"پوچھا تھا ــــ ... اُس نے جو کچھ بتایا میری سمجھ میں نہیں آیا ــــ" مادھو نے بیڑی سلگا کر
ایک گہرا کش لیا۔

"ارے اُنہوں نے زبردستی اپنی گیّاں کا دودھ نکالا اور تم بولتے ہو میرے کو مالوم نہیں۔ اور
اُس پر ظلم یہ کر بنا کھائے پیئے پورا دودھ گرا دیا اور چلے گئے۔"

مادھو کچھ نہیں بولا۔ وہ دور خلا میں دیکھتا بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ اُس کی بیوی تھوڑی

دیر تک بک بک جھک جھک کرتی رہی جب دیکھا کہ مادھو ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے تو اپنے ریں ریں کرتے بچے کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی اور پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

ابھی سورج لفف سہار پر نہیں آیا تھا۔ بھرت پور کے چھوٹے سے بازار کی ساری دُکانیں کھل گئی تھیں۔ جن کی کُل تعداد چار چھ سے زیادہ نہیں تھی۔ روزانہ صبح سڑک کے کنارے سبزی بیچنے والی عورتیں اپنی ٹوکریاں تقریباً خالی کر چکی تھیں بلکہ دو ایک نون تیل اور بچوں کے لیے چنا سینگ خرید کر اپنے گھروں کو سدھار بھی چکی تھیں۔ کاشی رام کے سدا نند ہندو ہوٹل میں تھامس ایلوا ایڈیسن کے زمانے کا پرانا گراموفون بج رہا تھا۔ "کہیں نہ ٹھیری، شکوے نہ کری، کچھ بھی نہ رہاں سے کام لیا" کاشی رام کرسی پر بیٹھا کاؤنٹر ٹیبل پر اپنی انگلیوں سے بے آواز تال دے رہا تھا۔ ہوٹل میں چار پانچ میلی کچیلی میز ریا لگی تھیں جن پر ڈھیر ساری مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ صرف دائیں کونے کی ایک میز پر بنڈی دھوتی پہنے دو لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہوٹل کا اکلوتا ویٹر چڈی بنیان پہنے، دائیں کاندھے پر میلا سا تولیہ ڈالے ایک کونے میں بیٹھا پیر پر پیر رکھے کٹورا گانے کی دھن پر اپنا گھٹنا ہلا رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے جمنا داس پان والے کی پان بیڑی کی دُکان تھی۔ دُکان میں ٹرانزسٹر پر کسی نئی فلم کا کوئی انتہائی شور انگیز گیت بج رہا تھا۔ سڑک کے کنارے املی کے درخت کے نیچے شمسو تانگے والا اپنے تانگے میں بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا۔ اور اُس کے تانگے میں جُتی کنگال گھوڑی کنوتیاں پھٹ پھٹاتی اپنی دُم سے بار بار مکھیاں اُڑا رہی تھی۔ پاس ہی تین چار لونڈے ایک دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے صبح تراب علی کے دودھ دوہنے والے واقعہ کو لے کر ہنسی ٹھٹھا کر رہے تھے۔

یکایک کہیں سے شنکھ پھونکنے کی آواز آئی۔ شنکھ پھونکنے کے فوراً بعد ڈھم ڈھم ڈھول بجنے لگا۔ لونڈے چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ شمسو ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔ جمنا داس نے ٹرانزسٹر کا کان اینٹھا۔ کاشی رام نے بھی گراموفون بند کر دیا۔ اتنے میں سامنے سے [illegible] کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے جو بیل گاڑی تھی اُس پر ایک شخص کھڑا بھونپو مُنہ سے لگائے چیخ رہا تھا۔

"بھرت پور کے باسیو! کبھی کبھی ایک صحیح فیصلہ اتہاس کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اور اب سمے آ گیا ہے کہ آپ پنڈت ونکار ناتھ کو ووٹ دے کر ایک نئے اتہاس کی شروعات کریں۔ پنڈت جی بھرت پور والوں کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ پنڈت جی کے پتا شری پنڈت ہزاری پرساد کے نام سے

سے دور دور تک کوئی سمبندھ نہیں ۔ میں کہتا ہوں صرف دودھ دوہنے سے کوئی جاتی برادری والا نہیں ہو جاتا ۔ انہوں نے محمد پیغمبر کی مثال دی کہ وہ بکریاں چراتے تھے اور دودھ دوہتے تھے اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔ مگر میں پوچھتا ہوں ان مثالوں کے لیے آخر سمندر پار جانے کی کیا ضرورت ہے ۔ ہمارے پُرانوں میں سب سے بڑی مثال تو ماکھن چور نند لال ہری گوپال کی ہے ۔ مجھے بتائیے شری کرشن سے بڑا گوالا اس دھرتی پر پیدا ہوا ہے ۔ نہیں نا ۔۔۔ تو پھر سُن لیجئے ہمارا یعنی پنڈت اونکار ناتھ کا رشتہ سیدھے کرشن گوپال ہی سے جُڑتا ہے ۔"

' پنڈت اونکار ناتھ کی جے ' کے نعرے سے پورا میدان گونج اُٹھا ۔ پنڈت جی لمحہ بھر کو رُکے پھر بولے " ہم ابھی وقت چل کر اپنے ہاتھوں سے آپ کو دودھ دوہ کر بتائیں گے ۔ اور اُسی گئو ماتا کا دودھ دوہیں گے جس کا اس سے پہلے دوہا گیا ۔ اور پرائے آکر ہماری ماتا کا دودھ دوہیں اور ہم جو اُس کی سنتان ہیں اپنی ماتا کے کشیر امرت سے محروم رہ جائیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔"

ایک بار پھر بیل گاڑیوں کا جلوس مادھو کے گھر کی طرف بڑھا ۔ چھکڑے سے پرے گاڑیوں کے پیچھے ہولیے کچھ اور لوگ بھی جو مفت کی تفریح کے دلدادہ تھے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مادھو کے گھر کی طرف چلے ڈھول بجاتا ، شنکھ پھونکتا اور نعرے لگاتا ہوا جلوس مادھو کے گھر کے سامنے پہنچ کر رُک گیا ۔ مادھو جلوس کو دیکھ کر ایک بار پھر سٹپٹا گیا ۔ سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا ۔ پنڈت اونکار ناتھ دھوتی کا چھور سنبھالتے اپنی رتھ گاڑی سے اُترے ۔ مادھو کے پاس آئے ۔ مادھو منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اُنھیں دیکھ رہا تھا ۔ پنڈت جی سفید براق لباس میں آسمانی دوت معلوم ہو رہے تھے ۔ اُن کی چوڑی روشن پیشانی پر سُرخ تلک اُن کی شخصیت کو مزید جاذب نظر بنا رہا تھا ۔ پنڈت جی مادھو کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے ۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے ۔

" مادھو ! ہم تم سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی گیا کا دودھ دوہنے کی اجازت دو ۔ ہم اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر یہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ اصلی گوالے ہم ہیں ۔"

اور اس سے پہلے کہ مادھو ہاں یا نا کہتا پھر کوئی ایک پیتل کا بھانڈا لے آیا ۔ پنڈت اونکار ناتھ نے کہا ۔ " ہم دودھ دوہنے سے پہلے گئو ماتا کی شدھی کریں گے ۔ پرائے ہاتھوں کے لمس سے ماتا اپوتر ہو گئی ہے !! " تُرنت کوئی دوڑ کر مندر کے پجاری سے پنچ پاتر میں گنگا جل لے آیا ۔ پنڈت اونکار ناتھ

نے پیپل کے پتے سے سونے کی زنجیر نکالی اور اُسے گنگا جل میں ڈبویا۔ پھر خود ہی سب کوئی منتر پڑھتے ہوئے
گائے پر گنگا جل کے چھینٹے دینے لگے۔ تھوڑا سا گلال گائے کی پونچھ پر لگایا۔ اور دودھ دوہنے بیٹھ گئے
صبح سے دو دفعہ دودھ دوہا جا چکا تھا۔ تھنوں میں ہاتھ لگاتے ہی گائے نے پچھلا پاؤں جھٹکا اور بھانڈا
لڑھک کر دور جا پڑا۔ پنڈت اوتار ناتھ منتر بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے گائے کے پٹھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے چمکارا۔
دونوں ہاتھ جوڑ کر گائے کو پرنام کیا۔ ایک رضاکار نے بھانڈا لا کر پھر گائے کے تھنوں کے پاس رکھ دیا اور
پنڈت جی دوبارہ دودھ دوہنے بیٹھ گئے۔ گائے کو چمکارتے پچکارتے تھنوں کو تھام لیا۔ گائے نے
کوئی تعرض نہیں کیا۔ تھوڑی دیر تک اُس کے تھنوں کو سہلا کر انھوں نے جو کھینچا تو پتلی سفید دودھ کی دھار
سیدھی بھانڈے میں گری ' ہر ہر مہادیو " کے نعرے سے مجمع پورا گونج اُٹھا۔ تقریباً پاؤ بھانڈا دودھ
دوہنے کے بعد پنڈت جی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پنڈت جی نے محسوس کر لیا کہ گائے کے تھنوں میں اب دودھ
کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں ہے۔ اُدھر گائے بھی دوبارہ پاؤں جھٹکنے لگی تھی۔

کچھ لوگوں نے بڑھ کر پنڈت جی کے گلے میں پھول مالائیں ڈالیں۔ پنڈت جی نے وہ ساری پھول
مالائیں گائے کے گلے میں ڈال دیں۔ ایک بار پھر پنڈت جی کی جے جے کار ہوئی۔ پنڈت جی نے ادھر
اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" مادھو کہاں ہے ؟ "

" وہ اُدھر کھڑا ہے " کسی نے اشارہ کیا۔

مادھو اپنے شکستہ مکان کے دروازے میں حیران و پریشان کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔
اُس کے ہونٹ ایک دوسرے پر اس قدر سختی سے جمے ہوئے تھے کہ لگتا تھا اب وہ قیامت تک ایک دوسرے
سے جدا نہیں ہوں گے۔ پنڈت جی بڑی اپنائیت سے آگے بڑھے اور مادھو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

" دھنیہ ہو مادھو ... تمھاری گائے آج پورے راشٹر کی آتما کا پرتیک بن گئی ہے "

مادھو کچھ نہ بولا۔ وہ بوکھلا گیا۔ پوری صورتِ حال اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی
تھی۔ پنڈت اوتار ناتھ اپنی رتھ گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ بیل گاڑیوں کا قافلہ نعروں کی گونج میں
دھول اُڑاتا، شنکھ پھونکتا، ڈھول بجاتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ بیل گاڑیوں کے ساتھ آئے ہوئے
گاؤں والے اور چھوکرے بالے بھی واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اب سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا اور سب بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔ لوگ دوپہر کا
بھوجن کر کے چارپائیوں پر اور آنگنوں میں پیڑوں کے نیچے بیٹھے بیڑی اور حقہ پیتے اور تمباکو
چباتے ہوئے آج کے جلسوں جلوسوں اور نیتاؤں کے دودھ دھلے ہونے کی باتوں کو لے کر اپنی اپنی سوجھ
بوجھ کے مطابق خیال آرائی کر رہے تھے۔ کچھ لوگ مرزا تراب علی کی جینٹلمین سپرٹ اور سادگی کی تعریف
کر رہے تھے اور کچھ پنڈت اونکار ناتھ کے علمی گھرانے اور اُن کی قومی اسپرٹ کے گن گا رہے تھے۔
ڈنگر مادھو اپنے گھر کے دروازے کے سامنے فکر مند بیٹھا تھا۔ آج اُس نے دوپہر کی روٹی بھی ٹھیک
سے نہیں کھائی تھی۔ بیوی نے جوار کی دو موٹی روٹیوں کے ساتھ بینگن کا ساگ پروسا تھا۔ آدھی پیاز
کی ڈلی بھی رکھی تھی مگر وہ بڑی مشکل سے صرف ایک روٹی اور تھوڑا سا ساگ حلق سے اُتار سکا۔ پھر
غٹ غٹ آدھا لوٹا پانی پی کر دھوتی سے منہ پونچھتا دہلیز میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سامنے بندھی گائے کو
غور سے دیکھا۔ گائے اپنے آگے پڑی خشک گھاس کی پتیوں کو دھیرے دھیرے چبا رہی تھی۔ اُس
کی آنکھوں میں کوئی بدلاؤ نہیں تھا۔ مادھو کی نگاہ اُس کے تھنوں پر پڑی۔ اُسے لگا آج اُس کے تھن
معمول سے زیادہ لٹکے ہوئے ہیں۔ مادھو نے اُسے تشویش سے دیکھا۔ بیڑی کے دو تین کش لیے اور
گھٹنوں پر سر ڈال کر بیٹھ گیا۔ بیوی نے روٹی کھا لی، بچے کو روٹی کھلائی۔ برتن سمیٹ کر ایک طرف
رکھے اور ایک کونے میں بوریا ڈال کر بچے کو پہلو میں لیے لیٹ گئی۔ اُس نے مادھو سے اُس کی
چنتا کا سبب بھی نہیں پوچھا۔ پوچھنا بھی فضول تھا۔ مادھو ایک ہی جواب دیتا۔ "معلوم نہیں"
مادھو دروازے پر بیٹھے بیٹھے اپنے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے اونگھ گیا۔

اتنے میں چاروں طرف سے تیز ہوا کے تھپیڑے چلنے لگے۔ جیسے زبردست آندھی آ رہی ہو۔ مادھو
کا شکستہ مکان خشک ٹہنی کی طرح کانپنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس نے دیکھا کہ بے شمار مویشی جن
میں گائیں، بیل، بھینسیں اور سانڈ بھی شامل تھے [illegible] تب اُسے پتہ چلا کہ دراصل
وہ آندھی نہیں تھی بلکہ اُن جانوروں کے دوڑنے کی دھمک سے زمین کانپ رہی ہے۔ مگر یہ کیا؟
اُن جانوروں میں سب سے آگے اُس کی اپنی گائے تھی اُس کی آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں، نتھنے پھڑپھڑا رہے
تھے اور مُنہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ وہ سر کو جھکائے دونوں سینگیں آگے کیے سیدھے اُسی کی طرف
دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ گویا صرف ایک ہی ٹکر میں اُسے دھرتی کے دوسرے سرے پر اُچھال دے گی۔

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا مگر گائے کی رفتار میں ذرا برابر فرق نہیں آیا۔ گائے قریب آتی جا رہی تھی ــ قریب اور قریب ــ مارے خوف کے اُس کے حلق سے گھُٹی گھُٹی سی چیخ نکل گئی۔ اچانک اُسے جھٹکا سا لگا اور اُس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے گائے اُسی طرح کھونٹی سے بندھی، دُم سے مکھیاں اُڑاتی آہستہ آہستہ منہ چلا رہی تھی۔ مادھو نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور ہونٹوں پر دو انگلیاں رکھ کر انگلیوں کی جھری میں سے منہ میں بھر آئے لعاب کو ایک طرف کو تھوکا۔

چانک اُسے ایک بار پھر لوگوں کے نعروں کی آوازیں سُنائی دیں۔ اُس نے کسی متوحش جانور کی طرح اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ نعروں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ تبھی اُس نے دیکھا کہ گاؤں کی اُسی اکلوتی سڑک پر ایک اور جلوس چلا آ رہا ہے۔ آگے آگے کوئی شخص دھوتی کُرتا پہنے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالے چل رہا تھا اور اُس کے پیچھے کچھ لوگ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگا رہے تھے۔ چند سے بدن اور دُبلے جسموں والے نوجوان کسی چالو قسم کی دُھن پر ناچ بھی رہے تھے۔

مادھو ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ جلوس والے اُس کے گھر کے سامنے آکر رُک گئے۔ دھوتی کُرتے والے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مادھو کو پرنام کیا اور اپنے زردی مائل دانتوں کی نمائش کرتا خواہ مخواہ ہی ہی کرنے لگا۔ پھر بولا۔

"مادھو بھائی! میرا نام بابو راؤ ہے۔ گریب لوگوں کی سیوا کے واسطے الیکشن میں کھڑا ہوں۔ میں بھی پہلے تمھاری طرح گریب تھا۔ ابھی اپنے کو بھگوان نے دو پیسہ دیا ہے پن میں گریبی کو نہیں بھولا ــــ گریب ہی گریب کے کام آتا ہے۔ یہ پیسے والے ایک نمبر کے حرامی ہوتے ہیں۔ گریب کا کھون چوستے ہیں۔ سالے جونک ہوتے ہیں جونک ــ میں نے سُنا ہے میرے سے پہلے اِدھر دو نیتا لوگ آکر گئے۔ تمھاری گائے کا دودھ بھی نکالا۔ دونوں بھی کھدر کی تھے۔ کسالی دودھ نکالنے سے کھدر کا تھوڑی ہو جاتا۔ ارے میں تو بچپن سے گؤ ماتا کی سیوا کرتا آیا ہوں، اُس کا گوبر اُٹھانا، اُسے نہلانا، اُس کا دودھ نکالنا اپنی گھُٹی میں پڑا ہے۔ ــ یہی اپنا کام ہے۔ دودھ کیسے نکالتے ہیں میرے سے پوچھو ــ مادھو بھائی میرے کو اپنی گائے کا تھوڑا دودھ نکالنے دو ......"

مادھو نے تُرنت بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بھگوان کے لیے ـــ اب اور نہیں ـــ گائے کے تھن میں اب ایک بوند بھی دودھ نہیں ہے۔ میں اب اُسے ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔"

"مادھو بھائی! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر میں نے تمھاری گائے کا دودھ نہیں نکالا تو بڑی بے اِجتی ہوگی کیوں کہ وہ لوگوں نے تمہاری گائے کا دودھ نکالا ہے۔ میں تھوڑا سا نکالوں گا جاد نہیں ـــ مادھوا بھائی! گریب کی اِجت گریب کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

مادھو نے بہت منع کیا مگر بابو راؤ ہاتھ جوڑ کر ایک ہی بات دوہراتا رہا۔

"گریب کی اِجت گریب کے ہاتھ میں ہے۔" بابو راؤ کے ساتھیوں نے بھی مادھو کو سمجھایا۔ دو چار اُسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ہر کوئی اُسے سمجھا رہا تھا۔ وہ بار بار منع کر رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اُنھیں کیسے سمجھائے۔ کیسے منع کرے کیوں کہ وہ تو اُس کی سن ہی نہیں رہے تھے صرف اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

پھر پتا نہیں کب اور کیسے ایک لوٹا منگوا لیا گیا۔ اور مادھو نے دیکھا کہ بابو راؤ اُس کی گائے کے پیروں کے پاس بیٹھا اُسے پچکار رہا ہے۔ مادھو لوگوں کے نرغے میں گھرا ایک عجیب سی بے بسی کے ساتھ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ گائے بے چینی سے پچھلے پاؤں جھٹک رہی تھی۔ بار بار دُم ہلا رہی تھی۔ دائیں بائیں سینگ چلا رہی تھی۔ مگر بابو راؤ بھی کافی ضدی تھا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح اُس کے تھنوں سے تھوڑا سا دودھ نچوڑ ہی لیا ـــ بابو راؤ کے چھوکرے ایک بڑا سا دائرہ بنا کر "گوبندا آ رے آلا" گانے لگے ـــ مادھو آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر جانے کب بابو راؤ نے اُسے دھنیہ واد کہا۔ کب وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ مادھو کو کچھ بھی یاد نہیں۔ جب اُس کے حواس ذرا درست ہوئے تو اُس نے دیکھا کہ سب لوگ جا چکے ہیں اور پچھم کی طرف سورج چند گز اور جھک گیا ہے اور پہاڑی کے پیچھے چھپ کر [illegible] اجالا روشن کر دیا ہے۔ پھر اُس نے اپنی گائے پر نگاہ ڈالی اور ایک دم سے چونک گیا۔ گائے اب زمین پر بیٹھ چکی تھی بلکہ بیٹھ جھکی تھی۔ اُس کا جگالی کرتا منہ بھی بند تھا اور اُس کی سفید سفید شیشہ آنکھوں کے ڈھیلے کافی پھیل گئے تھے۔ اُس نے اُس کے تھنوں کی طرف دیکھا۔ تھن سوجے ہوئے سے لگ رہے تھے اور [illegible] گرا [illegible] اُسے لگا اگر اب کے تھن کسی نے ذرا سا بھی چھیڑا تو بجائے دودھ کے

خون کے سُرخ سُرخ قطرے ٹپکنے لگیں گے۔ وہ گائے کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اُس کا ماتھا سہلانے لگا۔ پھر قریب پڑی خشک گھاس کے چند تنکے اُس کی طرف بڑھائے مگر گائے گھاس کھانے کی بجائے اُس کا ہاتھ چاٹنے لگی۔ مادھو کا دل بھر آیا۔ اور وہ منہ سے چ ۔۔۔ چ ۔۔۔ کی آواز نکالتا ہوا اُسے پچکارنے لگا ۔۔۔ جانے وہ کتنی دیر تک گائے کے پاس بیٹھا اُسے پُچکارتا پُچکارتا رہا۔ شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ آسمان پر بگلوں کی ایک ڈار اُڑتی ہوئی کسی طرف کو جا رہی تھی۔ بہت دُور جنگل سے ڈھور لوٹ رہے تھے۔ گڈریے چھوکروں کی ایہہ، ایہہ ٹر، ٹر، ہُر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مادھو گائے کے پاس سے اُٹھ کر دوبارہ اپنی دہلیز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی خوف زدہ نظریں گاؤں کی سڑک پر جمی ہوئی تھیں ۔۔۔ اگرچہ سڑک پہ دُور تک کوئی راہ گیر دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر نہ جانے کیوں اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ●●

سویرے اُٹھتے ہی سب سے پہلے اُسے اُس کی بیوی نے یاد دلایا کہ آج اُسے ناٹک دیکھنے جانا ہے۔ اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ باہر کی بیٹھک سے بوڑھا باپ کھانستا ہوا داخل ہوا۔

"کیوں بیٹا! ٹکٹ سنبھال کر رکھ لیا ہے نا؟"

"ہاں ــــ" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

جب وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلنے لگا تو ماں نے ٹوکا۔ "رک جا بیٹا!"

ماں کی بوڑھی انگلیوں میں ایک نیلا ڈورا چمک رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اُس نے ماں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امام ضامن ہے بیٹا ــــ"

ماں نے اُس کی آستین چڑھائی اور امام ضامن اُس کے بازو پر باندھ دیا۔ وہ ان رسموں کو فضول سمجھتا تھا تاہم اُس نے بغیر کسی احتجاج کے چپ چاپ امام ضامن بندھوایا کہ اس عمر میں ماں کو کسی بات سے باز رکھنا تقریباً ناممکن سا تھا۔ البتہ بیوی جب اُس کے منہ میں مصری کی ڈلی ڈالنے بڑھی تو اُس نے آہستگی سے اُسے جھڑک دیا۔ کوئی اور دن ہوتا تو بیوی خفا ہو جاتی مگر اُس وقت بیوی نے اُس کی جھڑکی کا ذرا اثر نہ لیا۔ وہ جلدی جلدی سب سے رخصت ہو کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا مگر اُسے یقین تھا کہ اُس کے گھر کے سبھی افراد دروازے میں کھڑے اُسے الوداعی نظروں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا۔

جب وہ ندی پار کرکے دوسری طرف پہنچا تو سورج آہستہ آہستہ سامنے پہاڑی کی طرف جھک رہا تھا۔ دور درختوں کے سائے آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو رہے تھے جیسے عین لڑائی میں فوجیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ندی کے اس طرف کا منظر گرد و غبار میں ڈوب گیا تھا۔ اور وہ پتلی سی چمکدار پگڈنڈی جس سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچا تھا شام کے پھیلتے سایوں میں رفتہ رفتہ دھندلانے لگی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنے بازو پہ ہاتھ پھیرا۔ امام ضامن کے مس کے ساتھ ہی ماں کا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ ماں کا جھریوں بھرا شفیق چہرہ۔ ماں کے چہرے کے ساتھ ہی اسے اپنی بیوی کا چہرہ بھی یاد آگیا جس کی آنکھوں کے سرمئی رستے میں دور تک اس کا تعاقب کرتے رہے تھے۔ ماں، بیوی، باپ، بھائی، دوست احباب، عزیز رشتے دار یکے بعد دیگرے کتنے ہی چہرے اسے اوپر یاد آتے چلے گئے۔ وہ بے چین ہو کر ندی کے اس طرف ہی اس پگڈنڈی کو دوبارہ تلاش کرنے لگا۔ جو اب شام کے دھندلکے میں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک ندی کے اس پار نیم اندھیرے نیم اجالے میں کچھ ڈھونڈتا سا کھڑا رہا۔ پھر چپ چاپ مڑ کر اس بڑی سڑک پر آگیا جس کے کنارے ایک تختی گڑی تھی اور جس پر جلی حروف میں لکھا تھا "ناٹک گھر" اور نیچے ایک بڑا سا تیر کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کی منزل قریب تھی۔ اس نے ایک بار جیب میں ہاتھ ڈال کر ناٹک کے ٹکٹ کو ٹٹولا اور اطمینان سے منزل کی سمت چل پڑا۔

پورا ناٹک گھر بجلی کے قمقموں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ اور اس کے ارد گرد لوگوں کی بے پناہ بھیڑ لگی تھی۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے کسی بہت بڑی روشن ہانڈی پر پتنگے ٹوٹے پڑ رہے ہوں۔ ناٹک گھر کے بڑے پھاٹک پر "ہاؤس فل" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ مگر وہ بے فکری سے سب کو دھکیلتا، ہٹاتا پھاٹک کے قریب پہنچ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور پھاٹک پر کھڑے سنتری کو دکھایا۔ سنتری نے [illegible] پھاٹک کے دروازے میں ہی ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول دی۔ اور وہ جھک کر کھڑکی کے راستے ناٹک گھر میں داخل ہو گیا۔

ہال تماش بینوں سے کھچا کھچ بھرا تھا اور لوگوں کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہال کی محرابی چھت پر باریک بلب ستاروں کی طرح ٹمٹما رہے تھے پر روشنی اس قدر مدھم تھی کہ کوئی بھی شکل واضح نہیں تھی۔ کچھ نوجوان دودھ جیسے سفید لباسوں میں ملبوس ہاتھوں

میں محدود روشنی کی ٹارچیں لیے اِدھر اُدھر گھوم کر تماش بینوں کو اُن کی نشستوں پر بٹھا رہے تھے۔ ایک گائیڈ کی رہنمائی میں وہ بھی اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ سامنے اسٹیج تھا جس پر زرد رنگ کا پردہ جھول رہا تھا۔ اسٹیج کے چاروں طرف سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پردے پر ایک بہت بڑی انسانی کھوپڑی بنی تھی۔ جس کی آنکھوں کے خلا میں دو سُرخ بلب جل بجھ رہے تھے۔ جنھیں غور سے دیکھنے پر لگتا جیسے کھوپڑی پلکیں جھپکا رہی ہو۔ کھوپڑی کے دائیں بائیں دو گھڑسوار دکھائی دے رہے تھے جن کے ہاتھوں میں دو لمبے لمبے نیزے تھے اور نیزوں کی انیاں کھوپڑی کے ٹھیک اوپر ایک پرندے کی شبیہ کے سینے میں اس طرح پیوست تھیں کہ سینے سے لہو کے قطرے ٹپک ٹپک کر کھوپڑی کو بھگو رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج کے پیچھے سے ماتمی دُھن سُنائی دینے لگی۔ جیسے سیکڑوں ہزاروں تھکے ہارے انسان اجتماعی طور پر اپنی مظلومیت کی دہائی دے رہے ہوں۔ ہال میں بیٹھے لوگوں کا شور اب دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ ہر کی تقریباً ساری نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔ اور اکّا دُکّا لوگ اب بھی چلے آ رہے تھے۔ گائیڈ ہاتھوں میں محدود روشنی والی ٹارچیں لیے اِدھر اُدھر سایوں کی طرح برابر گشت کر رہے تھے۔ ہال کی دیواروں پر کچھ پُراسرار قسم کی تصویریں نقش تھیں۔ مگر خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود اُن کے نقوش واضح نہیں ہو رہے تھے۔ حُزنیہ موسیقی، اسٹیج کے پردے پر دہشت دینے والی تصویر، دیواروں پر نقش مبہم شبیہیں، بھوتوں کی طرح حرکت کرتے گائیڈ، لوگوں کی دبی دبی سرگوشیاں، دھیرے دھیرے اُس کے دل و دماغ پر ایک نامعلوم سا خوف مسلط ہونے لگا۔ ہر چند کہ وہ بھوت پریت، جادو ٹونے پر یقین نہیں رکھتا مگر آخر وہ بھی آدمی تھا۔ رفتہ رفتہ ماحول کی پُراسراریت اس پر اثرانداز ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی وہ اپنے اردگرد کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ہال میں ایک تھرتھراتی ہوئی سی آواز گونجی۔

’’خواتین و حضرات!‘‘

اس آواز کے ساتھ ہی لوگوں کی سرگوشیاں صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگیں۔ وہ تھرتھراتی آواز کھُردرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

’’خواتین و حضرات! حسبِ معمول ہمارا کھیل شروع ہونے جا رہا ہے۔ ہمارے کھیل کی روایت بہت پُرانی ہے۔ شاید صدیوں پُرانی ہر حال یہ کھیل دکھانا ہماری روایت ہے اور اس کھیل کو

دیکھنا آپ کی مجبوری۔"

چیز ڈن کی زبردست گونج سنائی دی۔ جیسے کسی بہت بڑے گھڑیال کا گجر بجا ہو۔ ساتھ ہی سٹیج کے پردے میں حرکت ہوئی اور وہ وسیع و عریض پردہ درمیان سے شق ہو کر دائیں بائیں چھوئی موئی کی طرح سمٹتا چلا گیا۔ انسانی کھوپڑی، اس کی جلتی بجھتی آنکھیں دونوں گھڑسوار، کھوپڑی پر ٹنگا زخمی پرندہ، سب دو نیم ہو کر پردے کے چھوروں کے ساتھ ادھر ادھر سرکتے چلے گئے۔ اسٹیج اتھاہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھت میں ٹمٹماتے مدھم بلب بھی دھیرے دھیرے بجھتے جا رہے تھے۔ سٹیج کے عقب سے اٹھتی حزنیہ موسیقی کی لہریں کب کی خاموش ہو چکی تھیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن بے سود۔ اس کے سارے حواس اس کی آنکھوں میں مجتمع تھے اور دل کی دھڑکن کنپٹیوں کو پھاڑے ڈال رہی تھی۔ تبھی اس نے دیکھا کہ اسٹیج پر ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ جیسے کسی کی نیند سے بوجھل پلکیں دھیرے دھیرے اٹھ رہی ہوں۔ پھر کہیں سے ایک روشنی کا دائرہ سٹیج پر رقص کرنے لگا۔ دائرے میں ایک طویل القامت شخص کھڑا نظر آیا۔ جس کے دبلے پتلے بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا لمبا سا چوغا جھول رہا تھا۔ کھوپڑی بالکل گنجی تھی اور روشنی کے فوکس میں خوب چمک رہی تھی۔ اس کے طوطے جیسی مڑی ہوئی ناک اتنی دور سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ روشنی کے دائرے کے ساتھ دھیرے دھیرے تیرتا ہوا سا آ کر اسٹیج کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ پھر لوگوں کی طرف رخ کر کے اپنی ڈھیلی ڈھالی آستینوں والے ہاتھ اس طرح بلند کیے گویا دوسرے ہی لمحے فضا میں پرواز کر جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ غیر مانوس الفاظ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ پھر یک بیک خاموش ہو کر نہایت شستہ لہجے میں گویا ہوا۔ "خواتین و حضرات! سب سے پہلے میں اپنے تھیٹر کی جانب سے آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارا کھیل روز بروز بے حد مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ اس [illegible] ہے کہ اس وقت جتنے لوگ ہال میں بیٹھے ہیں اس سے چار گنا لوگ تھیٹر کے باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو حاضرین با تمکین! پیش خدمت ہے ہمارے کھیل کا اہم ترین آئٹم ——— صلیب' ———

وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "صلیب!"

پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر ادھر تاکا۔ سبھی لوگ اسٹیج کی جانب منہ اٹھائے بت

بنے بیٹھے تھے۔ تبھی ایک زبردست کڑکڑاہٹ ہوئی۔ اُس نے چونک کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ عبا پوش اب سرک کر اسٹیج کی دائیں طرف چلا گیا تھا اور وہاں کھڑے کھڑے دائیں بائیں، اوپر نیچے اس طرح اپنے دونوں ہاتھ چلا رہا تھا جیسے کوئی میوزک ڈائریکٹر اپنے آرکیسٹرا کو ہدایت دے رہا ہو۔ اب اسٹیج کے پس منظر سے ایک دل دہلا دینے والی موسیقی شروع ہو چکی تھی۔

کچھ لمحوں بعد اسٹیج کی دائیں جانب سے چند سیاہ پوش سپاہی مارچ کرتے ہوئے نکلے۔ وہ اپنے کاندھوں پر ایک بہت بڑی صلیب اٹھائے ہوئے تھے۔ اُن کے دائیں بائیں دو مسخرے اُچھلتے کودتے چل رہے تھے۔ مسخروں پر نظر پڑتے ہی ہال میں بیٹھے لوگ بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ مگر اُسے ذرا بھی ہنسی نہیں آئی۔ بھلا اس میں کون ہنسی کی بات تھی۔ اُس نے ہال میں بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اپنے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ مگر اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ہال میں بیٹھے لوگ تو اسی کی طرح چپ چاپ بیٹھے اسٹیج کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

”پھر یہ قہقہے؟“ دوسرے ہی لمحے بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ قہقہے ہال کی دیواروں پر لگے اسپیکروں سے چھوٹ رہے تھے۔ اُس نے اپنے پاس بیٹھے شخص سے جھک کر آہستہ سے پوچھا۔

”کیوں، آپ ہنس نہیں رہے ہیں؟“

”آں ـــــ ں ـــــ“ وہ شخص بے اختیار اُچھل پڑا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر گھبرائی گھبرائی سی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

”ہنس رہا ہوں۔ ہنس رہا ہوں۔ یہ دیکھیے ـــــ ہی، ہی، ہی“

سیاہ پوش سپاہی صلیب اٹھائے اسٹیج کے بیچ میں پہنچ گئے تھے۔ روشنی کا دائرہ اُن کے ساتھ ساتھ برابر حرکت کر رہا تھا۔ دوسری طرف عبا پوش اب بھی پورے جوش و خروش سے اپنے دونوں ہاتھ ہلائے جا رہا تھا۔ کانوں کو پھاڑ دینے والی موسیقی برابر جاری تھی۔ سپاہیوں نے اسٹیج کے بیچ میں پہنچ کر صلیب کو کاندھوں سے اتار دیا۔

”یہ کیسا ناٹک ہے؟ اسٹیج پر صلیب کا کیا کام؟“

اُس نے ایک بار پھر اپنے پاس بیٹھے شخص کے کان میں سرگوشی کی۔

”مجھے نہیں معلوم، آپ چپ رہیے، آپ چپ رہیے۔“

لگایا۔ پھر اطمینان سے گردن ہلاتا ہوا سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔

"جاؤ ــــــ صلیب لگ چکی مسیحا کو لے آؤ ــــــ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔"
سپاہی تھوڑی دیر تک آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ پھر ایک سپاہی آگے بڑھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتا ہوا بولا۔

"خداوند! اس کلجگ میں کسی مسیحا کا ملنا محال ہے۔"

"بکواس مت۔" عباپوش گرجا ــــــ جب تک صلیبیں بنتی رہیں گی مسیحا پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس صلیب کو بھی مسیحی پیدا ہو چکا ہے۔ وہ دیکھو میری اُنگلی کی سیدھ میں یہاں سے ٹھیک بیسویں قطار میں جو شخص بیٹھا ہے وہی ہماری اس صلیب کا مسیحا ہے۔ جاؤ اُسے نہایت عزّت و احترام سے لے آؤ۔ تاکہ اُسے مصلوب کر کے ہم صلیب کی روایت کو برقرار رکھیں۔"

عباپوش کے الفاظ اُسے چابک کی طرح لگے۔ اُس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ اور تبھی اُسے لگا کسی نے اُس کے بدن کی ساری قوت سلب کر لی ہو۔ پورے ہال میں سوائے اُس کے ایک بھی متنفّس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے سے دوبارہ حُزنیہ دُھن شروع ہو چکی تھی جیسے سیکڑوں ہزاروں تھکے ہارے انسان اجتماعی طور پر اپنی مظلومیت کی دہائی دے رہے ہوں۔

بیضوی چھت کے بلب دھیرے دھیرے روشن ہوتے جا رہے تھے۔ اور عباپوش کی اُنگلی عین اُس کے سینے کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ ●●

مسٹر نوبڈی

"بھارت میرا ملک ہے سب بھارتی میرے بھائی اور بہنیں ہیں مجھے اپنے وطن سے پیار ہے اور میں اس کے عظیم اور گوناگوں ورثے پر فخر محسوس کرتا ہوں میں ہمیشہ اس ورثے کے قابل بننے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ میں اپنے والدین، استادوں اور بزرگوں کی عزت کروں گا۔ اور ہر ایک سے خوش اخلاقی کا برتاؤ کروں گا۔ میں اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے لیے خود کو وقف کرنے کی قسم کھاتا ہوں۔ ان کی بہتری اور خوشحالی میں ہی میری خوشی ہے"

تمام بچے ہاتھ اٹھا کر عہد کر رہے تھے اور وہ ان میں سے ایک ایک کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ سب کے چہروں پر بھولپن تھا۔ اور آنکھوں سے انتہائی معصومیت مترشح تھی۔ نہیں ان میں سے کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر ان کے علاوہ پھر کون ہو سکتا ہے؟ انہیں میں سے کوئی ہے مگر اس وقت کس قدر معصوم سا لگتا ہے جیسے کچھ نہیں جانتا، کچھ نہیں کرتا، شیطان ــــــــ نہیں اسے ڈھونڈ نکالنا ہی ہوگا۔ ورنہ ساری کلاس کا ڈسپلن برباد ہو جائے گا۔

عہد ختم ہو چکا تھا۔ [illegible] نے کلاس پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولے
"سیٹ ڈاؤن" سب اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

وہ چاک لے کر مڑا اور بلیک بورڈ پر تاریخ لکھنے لگا اسی وقت ایک کاغذ کا تیر اس کے کان کے پاس سے سرسراتا ہوا گزر کر نکلا اور بلیک بورڈ سے ٹکرا کر اس کے گریبان میں اٹک گیا ۔ اس کا بلیک بورڈ پر چلتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ اس نے ذرا سا گردن جھکا کر کاغذی تیر کو دیکھا پھر اسے بائیں ہاتھ کی چٹکی سے

پکڑ کر کلاس کی طرف مڑا پوری کلاس اسی طرح شانت اور گمبھیر تھی۔
"یہ کس کی حرکت ہے؟"
"کوئی کچھ نہیں بولا"
"میں پوچھتا ہوں یہ کس کی حرکت ہے؟" اس کی آواز تیز ہو گئی۔ مگر کلاس میں خاموشی برقرار تھی۔
"تم لوگ بول نہیں رہے ہو؟" مدن نے غصے سے کہا۔ "چلو سب اپنی اپنی سیٹوں پر کھڑے ہو جاؤ۔"
تمام بچے فوراً ہی اپنی اپنی سیٹوں پر کھڑے ہو گئے۔ مدن نے خشونت آمیز نگاہوں سے ایک ایک کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جوں ہی اس سے آنکھیں چار ہوتیں بچے سہم کر اپنی نظریں نیچی کر لیتے۔ کلاس کا چکر لگا کر وہ بلیک بورڈ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور اپنے لہجے کو حتی الامکان گمبھیر بنا کر بولا۔
"ابھی ابھی تم لوگوں نے عہد کیا تھا کہ میں اپنے والدین استادوں اور بزرگوں کی عزت کروں گا مگر یہ ——" کاغذی بان اس نے چٹکی میں پکڑے کاغذ کے تیر کو اپنے سر سے اوپر اٹھایا۔ "یہ بتا رہا ہے کہ تم اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے۔"
"جی" بچوں نے ایک ساتھ باآواز بلند کہا۔
"مگر سر! یہ ہم نے نہیں پھینکا"
"ٹھیک ہے تم نے نہیں پھینکا۔ مگر پھینکنے والا تمہیں میں سے ایک ہے مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے؟"
اس سوال پر سب نے اپنی گردنیں جھکا لیں۔ وہ تھوڑی دیر تک ان کے جواب کا منتظر رہا۔ پھر چاک لے کر کے بلیک بورڈ کی طرف مڑتا ہوا بولا۔
"آج سزا کے طور پر تم لوگ پورا پیریڈ بنچوں پر کھڑے رہ کر پڑھو گے۔ چلو سبق نمبر ۲۴ نکالو۔ میں کون ہوں؟"
ابھی وہ بلیک بورڈ پر سبق کا نام ہی لکھ رہا تھا کہ پیچھے سے سیٹی کی آواز گونج اٹھی۔ مدن جھٹکے سے مڑا۔ مگر کلاس کے سارے بچے اسی طرح گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔
"کون تھا؟ بتاؤ کون تھا؟"
"وہ چیخا ——" چیخا ——" اور بچے اسی طرح گردنیں جھکائے نظریں نیچی کیے خاموش

کھڑے تھے ۔ چیختے چیختے مدن کا گلا رُندھ گیا ۔ بدن پر رعشہ طاری ہوگیا ۔ آنکھیں اُبل پڑیں ۔
اور چہرہ سُرخ ہوگیا ۔ مگر بچوں پر اس کے اس غصے کا کوئی اثر نہیں تھا ۔ نہ جانے وہ کب تک ان پر
برستا گرجتا رہتا کہ تبھی دوسرے پیریڈ کا گھنٹہ بجا ۔ وہ روتے روتے اچانک رک گیا ۔ بچے سہمے سے کسی
طرح کھڑے تھے ۔ وہ چند لمحے خاموشی کے ساتھ ہانپتا رہا ۔ پھر پیر پٹختا ہوا کلاس سے
باہر نکل گیا ۔

مدن کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ کوئی ہے جو چپکے چپکے اس کے خلاف سازش کر رہا ہے
کوئی ہے جو اس قدر پریشان کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ جائے ۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے اسٹاف روم میں آکر بیٹھ گیا ۔ اسٹاف روم خالی تھا ۔ اس کے
ساتھی ٹیچر شاید اپنا اپنا پیریڈ پڑھانے کلاسوں میں جا چکے تھے ۔ اس نے رجسٹر کا بستہ اور
فائل کو میز پر پٹخ کر ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا ۔ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں ۔ ابھی
اسے آنکھیں موندے پانچ سیکنڈ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ کسی کے ہنسنے کی آواز پر وہ چونک گیا ۔ اس
نے آنکھیں کھول کر دیکھا کمرے میں تو کوئی بھی نہیں تھا ۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا باہر جھانک
کر دیکھا پورا کاریڈور یہاں سے وہاں تک سنسان پڑا تھا کوئی بھی تو نہیں تھا ۔ کلاس کے کمرے سے [illegible]
کے پڑھانے کی آواز آرہی تھی ۔

I KNOW A FUNNY LITTLE MAN

AS QUIET AS A MOUSE

WHO DOES THE MISCHIEF THAT

IS DOVE

IN EKERY BODY'S HOUSE

THERE'S NO ONE EVER SEE\ HIS
FACE

AND YET WE ALL AGREE

THAT EVERY PLATE WE BREAK

WAS CRACKED

BY MR. NO BODY..

وہ پلٹ کر کمرے میں آیا۔ کچھ دیر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر دبے قدموں باتھ روم کی طرف بڑھا۔ باتھ روم کا دروازہ بند ہوا تھا۔ اسے شبہ ہوا کہ ضرور اس میں کوئی چھپا ہے۔ اس نے ہینڈل پکڑا، ایک لمحہ رکا، پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ باتھ روم خالی پڑا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ واپس مڑا۔ اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کمرے میں کسی کے چھوٹے چھوٹے پیروں کے نشان سے بنے ہوئے ہیں جیسے ابھی ابھی کوئی گیلے قدموں کے ساتھ وہاں سے گزرا ہو۔ "کمال ہے" بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ اس نے یوں ہی گردن اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا چھت میں پنکھا گھر گھرا رہا تھا۔ اور بائیں کونے میں ایک موٹی سی چھپکلی بآہستگی ایک پتنگے کی طرف رینگ رہی تھی۔ وہ دوبارہ آکر کرسی میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ کون ہے جو اُسے اس طرح پریشان کر رہا ہے؟ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ پھر اُس نے سوچا یہ محض اس کا واہمہ نہ ہو۔ دماغ کا خلل ہے۔ کیا اسے کسی ڈاکٹر سے اپنا علاج کرنا چاہیئے؟ یا کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرنا چاہیئے۔ مگر محض واہمہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ سب کچھ اس کے سامنے ہو رہا تھا۔ پھر اچانک ایک خیال سے وہ چونک گیا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے وہ دوسروں کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ مگر یہ بات وہ کس سے پوچھے؟ کہیں لوگ اس کا مذاق نہ اڑانے لگیں۔ مگر نہیں اسے کسی نہ کسی طرح تو معلوم کرنا ہی ہوگا کہ ان اَن دیکھی شرارتوں کا وہ اکیلا ہی شکار ہو رہا ہے یا دوسرے بھی اسے محسوس کر رہے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

اتنے میں اسٹاف روم کا دروازہ کھلا۔ اور شاستری جی اندر داخل ہوئے۔ مدن کو لگا وہ کچھ پریشان سے ہیں۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ شاستری جی کے ہونٹوں پر جھینپی جھینپی مسکراہٹ آگئی۔ وہ اپنا فائل میز پر رکھتے ہوئے بولے،

"ہیلو! مدن!"

"اس نے بھی جواب میں ہیلو کہا"

شاستری جی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ مدن نے شاستری جی کی طرف غور سے دیکھا۔ شاستری جی رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ پسینہ پونچھ چکنے کے بعد انہوں نے رومال میز پر پھینک دیا۔ اور جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی اور ایک پان کا بیڑہ منہ میں ڈال لیا۔ پھر ڈبیہ مدن کی طرف بڑھاتے

ہوئے بولے " ہاں ــــ "

مدن نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اس نے سوچا پہلے شاستری جی ہی سے شروعات کرے۔ مگر کیسے۔ شاستری جی منہ چلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ بے چین سے دکھائی دے رہے تھے۔ مدن نے پوچھ لیا۔

"کیوں شاستری جی، کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان ہیں؟"

"کون؟" شاستری جی چونک گئے۔ ان کا چلتا منہ رک گیا۔

"نہیں تو ــــ" پھر وہ پیچھے پنکھے کی طرف دیکھ کر بولے "آج گرمی کچھ زیادہ ہے" پھر اٹھ کر پنکھے کے ریگولیٹر کو گھما دیا۔ پنکھے کی اسپیڈ بڑھ گئی۔ شاستری دوبارہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ مدن شاستری کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ شاستری کرسی پر بیٹھ گئے، پھر اپنے کرتے کے بٹن کھول کر ہوا کھانے لگے۔ اچانک شاستری جی کی آنکھیں مدن کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ مدن کو یوں اپنی طرف گھورتا دیکھ کر شاستری جی جھینپ سے گئے۔

"کیا بات ہے؟ تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں"، مدن نے بدستور شاستری کے چہرے پر نگاہیں جمائے رکھیں۔

"کچھ نہیں ــــ کچھ بھی تو نہیں ــــ" شاستری جلدی جلدی پان چباتے ہوئے بولے

"پھر بھی"

شاستری کرسی کی پشت سے ٹک گئے، اپنے چکنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اور ایک گہری سانس لے کر بولے۔

"آج کلاس میں ایک عجیب واقعہ ہوا"

"کیا ہوا؟"

میری تیس سال کی سروس میں یہ کبھی نہیں ہوا تھا"

"آخر بتائیے تو کیا ہوا؟"

میں دسویں کلاس میں انگریزی کی نظم پڑھا رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے کوئی زور سے چیخا۔ "[illegible] فول" میں نے مڑ کر دیکھا۔ سب طلبہ شانت بیٹھے تھے، میرے [illegible] بھی

کون بولا تھا۔ سب بچے خاموش تھے۔ میں نے غصے سے پوچھا سچ سچ بتاؤ ابھی پیچھے سے کون بولا تھا۔ مگر بچے اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ جب کافی دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ تو میں نے سب کو سخت سست کہا اور نظم کو آگے پڑھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بھی نہیں گذری تھی کہ پھر پیچھے سے آواز آئی۔ "یہاں آ ادھر سے مینڈک" اب تو میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ میں نے پوری کلاس کو کھڑا کر دیا اور سختی سے بولا۔ بتاؤ وہ کون ہے جو پیچھے بیٹھا مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ تمام بچوں نے یک زبان کہا۔

"سر! ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی"۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا تو کیا میں پاگل ہوں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ کوئی پیچھے سے مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ مگر بچوں نے پھر بڑی معصومیت سے اس کی تردید کر دی۔ تب میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی میں نظم کا پہلا بند بھی نہیں ختم کر پایا تھا کہ پیچھے سے ایک زور کا پٹاخہ پھوٹا۔ میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا مگر وہاں سب پُرسکون بیٹھے تھے۔ میں نے گرج کر کہا۔

"بتاؤ ــــ کون ہے وہ ــــ؟ کون یہ شرارتیں کر رہا ہے؟"

ایک بچے نے پوچھا۔ "اب کیا ہوا؟"

جس نے پوچھا تھا میں نے اسی کو بینچ پر کھڑا کر دیا۔ اور دہاڑ کر بولا۔

"کلاس میں پٹاخے چھوڑتے اور کہتے ہو اب کیا ہوا"

اس بچے نے بلکہ کلاس کے سبھی بچوں نے مجھے حیرت سے دیکھا کیونکہ ان کے مطابق کلاس میں کسی نے بھی ان میں سے پٹاخے کی آواز نہیں سنی تھی۔ تب میں غصے سے پیر پٹختا ہوا کلاس سے باہر نکل آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ایسے شیطان بچوں کو بھلا کیوں کر پڑھایا جا سکتا ہے۔

شاستری سانس لینے کو رُکے۔ تب مدن نے بھی شاستری کو [illegible] کچھ بتا دیا جو اس کے ساتھ بیتا تھا۔

دونوں کافی دیر تک بیٹھے صورت حال پر غور کرتے رہے آخر دونوں نے طے کیا کہ پرنسپل سے جا کر بچوں کی شکایت کرنا چاہئے۔ ورنہ معاملہ اور بڑھ سکتا ہے۔ دونوں اٹھے اور پرنسپل کے آفس میں پہنچے۔ آفس میں پرنسپل نہیں تھے چپراسی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ باتھ روم گئے ہیں۔

اور کسی وجہ سے کافی برہم ہیں۔ دونوں وہیں آفس کے باہر بیٹھے پرنسپل کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پرنسپل صاحب باتھ روم سے برآمد ہوئے۔ اور آفس میں داخل ہوئے ان کا موڈ واقعی ٹھیک نہیں تھا۔ ان دونوں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے اسی برہمی کے ساتھ ان کے سلام کا جواب دیا۔ اور بڑبڑانے لگے۔

"آخر آپ لوگ بچوں کو کیا پڑھاتے ہیں اگر تعلیم سے ان میں معمولی تمیز بھی پیدا نہ ہو سکیں تو تعلیم کا فائدہ کیا؟"

شاستری اور مدن ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ آخر مدن نے ڈرتے جھجکتے پوچھ ہی لیا کہ کیا ہوا؟"

"کیا ہوا"؟ پرنسپل بھڑک گئے

"ارے میں آفس میں بیٹھا لکھ رہا تھا کہ اس طرف کھڑکی میں سے کوئی بچہ منہ ڈال کر گندے طریقے کی حرکتیں کرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر کھڑکی تک پہنچتا' وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں نے چپراسی کو کہا اس بچے کو پورے اسکول میں تلاش کیا جائے وہ ساری کلاسیں چھان آیا۔ کوئی اپنی غلطی قبولنے کو تیار ہی نہیں۔"

وہ دونوں چپ ہی رہے۔ پرنسپل تھوڑی دیر تک غم و غصہ پر قابو کرتے رہے۔ اور آخر ان سے پوچھا کہ وہ کس کام سے آئے ہیں۔ دونوں نے مختصر لفظوں میں اپنی اپنی بات سنا دی۔ دونوں کی باتیں سن کر پرنسپل کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ اور بولے

"کل مسٹر راناڈے بھی ایسا ہی شکایت کر رہے تھے ہر کلاس میں ایک دو شریر بچے ہیں جو پورے اسکول کا نظام بگاڑنے پر تلے ہیں۔ انہیں ڈھونڈ نکالنا ضروری ہے ورنہ پورا اسکول تباہ ہو جائے گا۔"

انہوں نے اسی وقت نوٹس نکالا کہ لنچ بریک سے پہلے اسٹاف روم میں میٹنگ ہے تمام ٹیچرز حاضر رہیں چپراسی نوٹس بک پر تمام ٹیچروں کے دستخط لے آیا۔

مدن اور شاستری واپس اسٹاف روم میں آکر بیٹھ گئے ابھی لنچ بریک میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔

"ہم تو سمجھ رہے تھے۔ صرف ہمارے ساتھ ہی شرارتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں تو لگتا ہے پورا اسکول

بھی اس کا شکار ہے۔"

"خود پرنسپل کو چھٹیر، جا رہا ہے، یہ تو کمال ہو گیا۔ اس سے پہلے اس اسکول میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

شاستری نے پان کی ڈبیہ سے دوسرا پان نکال کر کلّے میں دبا لیا۔

"آپ کیا خیال ہے شاستری جی؟ آخر بچے شرارت کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں؟"

مدن نے بھی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لی۔ شاستری نے تو پہلے ادھر ادھر محتاط نگاہوں سے دیکھا۔ پھر مدن کی طرف ذرا سا جھکتے ہوئے بولے۔

"کیوں نہ کریں جی! اس اسکول میں ان کے لیے رکھا ہی کیا ہے! لیبارٹری، لائبریری تو دور کی بات ہے۔ پانی پینے کے لیے تو ڈھنگ کا واٹر روم تک نہیں۔ پیشاب گھر ہے تو اتنا چھوٹا ہے کہ بچوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ایک دم ناکافی ہے۔ پیشاب کے لیے بیچارے بچے باہر اسکول کی نالی پر جاتے ہیں۔ پتہ ہے نا! چار روز پہلے ایک بچہ نالی میں گر گیا تھا۔ اچھا ہوا کہ ایک راہ گیر کی نظر پڑ گئی ورنہ پتا نہیں اس بیچارے کا کیا حشر ہوتا۔ اسکول کیلئے نہ کوئی کھیل کا میدان ہے نہ کوئی کھیل کا سامان ——— جب بچوں کو اپنے بیشتر تخلیقی صلاحیتوں کو صحیح ڈھنگ سے اجاگر کرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ اسی طرح شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ تو چائیلڈ سائیکولوجی کا معمولی سا نکتہ ہے جو تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی۔"

آپ ٹھیک کہتے ہیں شاستری جی! آپ یہی باتیں میٹنگ میں کہہ دیجیے۔"

اچانک شاستری کو ٹھسکا لگا اور وہ منہ پر رومال رکھے کھانسنے لگے۔ تھوڑی دیر تک کھانستے رہنے کے بعد منہ پونچھتے ہوئے بولے۔

"ہاں ——— ہاں کہوں گا ——— میں کیا ڈرتا ہوں ——— ضرور کہوں گا۔"

"کیا کہیں گے شاستری جی؟"

بھاٹے راؤ اندر آتے ہوئے بولا۔ بھاٹے راؤ کو دیکھتے ہی شاستری جی سٹپٹا گئے۔ کیونکہ مشہور تھا کہ بھاٹے راؤ پرنسپل کا چمچہ ہے۔ اور ادھر کی ادھر کرتا رہتا ہے۔

کچھ نہیں ——— کچھ نہیں ——— آج لنچ بریک میں پرنسپل صاحب نے اسٹاف میٹنگ رکھی ہے۔ یہی کہہ رہا تھا۔ شاستری جی کی ساری ہوا نکل گئی۔

"ہاں نوٹس آیا تھا۔"

بھلے راؤ تم جانتے ہو کہ میٹنگ کس تعلق سے بلائی گئی ہے؟" مدن نے پوچھ لیا۔

"ہاں —— ہاں —— اچھی طرح جانتا ہوں۔"

بھلے راؤ مسکرایا۔

"تو کیا —— تمہارے ساتھ بھی کوئی شرارت ہوئی ہے۔"

"میرے ساتھ کیا، اسکول کے ہر ٹیچر کے ساتھ ہوئی ہے —— جو بھی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے بھلے راؤ؟"

"میں کیا بول سکتا ہوں آپ لوگ اس اسکول کے سینیر ٹیچر ہیں۔ آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ لوگ ہی بتائیے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

شاستری جی کا خیال ہے کہ .... " مدن نے کہنا چاہا۔

"نہیں —— نہیں —— میرا کوئی خیال وہال نہیں" شاستری نے جلدی سے کہا۔

"ہاں —— ہاں —— شاستری جی کیا خیال ہے آپ کا؟" بھلے راؤ بولا۔

"شاستری جی کا خیال ہے کہ ......"

ارے تم کمال کرتے ہو۔ تم اپنا خیال کیوں نہیں بتاتے میرے ماتھے پر ٹھنک کیوں بجاتے ہو۔

نہیں —— میرا کوئی خیال نہیں۔"

اتنے میں ٹن ٹن ٹن گھنٹی بجی، لنچ بریک ہو گیا تھا۔ باہر یک دم سے بچوں کا شور ہونے لگا۔

میں ذرا باہر دیکھوں —— آج نگرانی کی ڈیوٹی میری ہے۔

کہتا ہوا بھلے راؤ باہر چلا گیا۔

"یار تم بھی کمال کرتے ہو —— میرا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ تم تو جانتے ہو یہ بھلے راؤ پرنسپل کا کتنا بڑا چمچہ ہے۔"

"مجھے معلوم ہے شاستری جی، مگر اس سے کب تک ڈرا کریں گے۔"

"ڈرنے کی بات نہیں مجھے ریٹائرڈ ہونے میں دو سال باقی ہیں —— آخری عمر میں کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پھر تم خود بھی تو کہہ سکتے ہو مجھی سے کیوں کہلوانا چاہتے ہو۔"

"میں کیا کہوں، یہاں کون کس کی سنتا ہے۔ سب کو اپنی اپنی دال روٹی کی فکر ہے۔"
اتنے میں چق ہٹی اور اسٹاف کے لوگ ایک ایک دو دو کر کے اندر آنے لگے۔
"ہیلو"
"ہاؤ آر یو"
"تمہارا تیسرا پریڈ کہاں تھا مسٹر شرما؟"
"آج صبح سے تین اناسین لے چکا ہوں پھر بھی سر درد کم نہیں ہوا۔"
"ارے گاؤسکر کا اسکور کیا ہوا؟ پونے بارہ تک تھرٹی سکس ہوئے تھے۔"
"آج پھر بینک میں ڈاکے کی خبر ہے۔"
"سالے یہ فسادات کا سلسلہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا، آج چھ جگہ فسادات ہوئے۔"
"ہونے دے یار — اسی بہانے سالی کچھ تو آبادی گھٹے گی۔"
"موڈرن کرنے سے مردے کا بوجھ کم نہیں ہوتا مسٹر جگجیت۔"
"سب چھوڑو یار — یہ سالا میٹھا تیل تیس روپے کلو ہوگیا ہے۔ آخر آدمی کمائے تو کیا کھائے۔"
"اس مہینے مہنگائی بھتے میں ساڑھے سات روپے کا اضافہ ہو گیا۔"
"ہاں — اونٹ کے منہ میں زیرہ"
"خبر ہے کہ آتنک وادی اپنے شہر میں گھس آئے ہیں۔"
"گھس آنے دو تم کیوں چنتا کرتے ہو۔ ان کا نشانہ تو بڑی بڑی ہستیاں ہیں ایک ٹیچر ٹیچر کے خون سے وہ اپنے ہاتھ کیوں خراب کرنے لگے۔"
"آج یہ ایمرجنسی میٹنگ کیوں بلائی گئی ہے؟"
"پتہ نہیں، — لٹالے راؤ کو معلوم ہوگا۔"
"ہاں بھلے راؤ کو تو یہ تک معلوم ہے کہ پرنسپل صاحب دن میں کتنی بار سانس لیتے ہیں۔ اور کتنی بار ہوا خارج کرتے ہیں۔"
"مگر بھلے راؤ ہے کہاں؟"

ہوگا کیوں! وہ میں آفس میں بیٹھ کر نپٹ رہا ہوگا۔

اتنے میں گھنٹی بجی اور پرنسپل صاحب روم میں داخل ہوئے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے تو تمام لوگ اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ پرنسپل صاحب باوقار انداز سے چلتے ہوئے اپنی مخصوص کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب بیٹھ گئے۔ انہوں نے چبھتی ہوئی ایک نگاہ اپنے پورے اسٹاف پر ڈالی۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"ساتھیو! میں رسمی تمہید باندھنے کی بجائے سیدھے بات شروع کرتا ہوں۔ دراصل مجھے شکایتیں ملی ہیں کہ ہمارے اسکول کا ڈسپلن بہت خراب ہو گیا ہے بلکہ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے یہ ہم زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے۔ سکول ــــ میں ــــ بلکہ ہر کلاس میں کچھ ایسے بچے داخل ہو گئے ہیں جو اپنی حرکتوں سے اسکول کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے دو سال سے رزلٹ بھی تسلی بخش نہیں آ رہے ہیں۔ اس بات کو اخبارات میں بھی اچھالا گیا تھا۔ آخر یہ سب کون کر رہا ہے یا کروا رہا ہے؟ اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟ ہمارے سکول کی بدنامی سے کن لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے مگر یہ ضرور کہیں گے۔ وہ جو بھی ہوں اسکول ہی کے نہیں قوم کے دشمن ہیں۔ کیونکہ اس سے ہوگا یہ کہ جب اسکول بہت بدنام ہو جائے گا تو انکوائری بھی ہو سکتی ہے ہماری گرانٹ بند ہو جائے گی گرانٹ بند ہوگی تو یہ اسکول بھی بند ہو جائے گا۔ وہ دن ہمارے حق میں بہت برا دن ہوگا۔ اس دن کو ٹالنے کے لیے مجھے آپ تمام لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم نے طے کر لیا ہے۔ اسکول سے گندے اور شریر بچوں کا صفایا کر کے رہیں گے۔ ہم نے تمام چپراسیوں، اسکول کے سکیورٹی گارڈز کو سختی سے حکم دیا ہے کہ وہ ایسے بچوں پر کڑی نظر رکھیں اور جہاں بھی کوئی شرارت کرتا نظر آئے ہمیں فوراً اطلاع دیں۔ آپ لوگوں کو بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ ایسے طلبا کی ایک خفیہ فہرست تیار کریں اور آفس میں پیش کریں ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ آپ لوگوں کو بھوک لگی ہوگی ــــ" پرنسپل صاحب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

"کسی کو کچھ کہنا ہے؟"

پرنسپل کی سوالیہ نگاہیں ایک ایک کا جائزہ لینے لگیں۔ سب خاموش تھے۔
مدن نے شاستری کی طرف دیکھا۔ شاستری نے بھی مدن کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور دونوں نے نظریں جھکالیں۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے نظریں نہ ملا سکے۔
تبھی کہیں سے ایک کاغذ کی گولی میز پر آکر گری۔ سب چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پرنسپل کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ اب ان لوگوں کی یہ جرأت کہ ......"
بھانے راؤ نے لپک کر گولی اٹھالی، اسے کھولا، "سر اس میں کچھ لکھا ہوا ہے۔"
"کیا لکھا ہے پڑھو" ــــــ پرنسپل کی آواز میں برہمی تھی۔
بھانے راؤ نے مڑی تڑی گولی کو کھول کر پڑھنا شروع کیا ــــــ
"جب تک ......"
"نہیں ٹھہرو ــــــ" اچانک پرنسپل نے چٹھی بھانے راؤ کے ہاتھ سے لے لی۔ پھر اسٹاف کی طرف دیکھ کر بولے۔
"ذرا کوئی باہر جھانک کر دیکھو ــــــ باہر تو کوئی نہیں!"
مدن کی کرسی دروازے کے قریب تھی طوعاً و کرہاً اُسی کو اٹھنا پڑا۔ چق ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر اسٹول پر چپراسی سنگت رام بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اور دونوں طرف کی گیلریاں اس کونے سے اُس کونے تک سنسان پڑی تھیں۔ ●●

چیخ کر زمین پر لڑھک گئی تھی ۔ دوسرا وار اس کی گردن پر پڑا تھا اور کلہاڑی شہ رگ کے ساتھ ہنسلی کی ہڈی کو بھی توڑتی نکل گئی تھی ۔ تیسرے وار کی ضرورت نہیں پڑی گلے سے خرخر کی مسلسل آواز کے ساتھ اس کی پتنی چند ثانیے تک فرش پر پڑی تڑپتی رہی ۔ پھر وہ ساکت ہو گئی ۔ اُس نے جھک کر اس کی ساڑی سے کلہاڑی کو پونچھ کر صاف کیا اور کلہاڑی کو اپنی کمر میں کھونس کر ادھر اُدھر دیکھا ۔ دروازہ کھلا تھا ۔ وہ بھکاری اپنے جوتے چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا ۔ اُس نے باہر نکل کر ارد گرد ایک نگاہ ڈالی ۔ چاروں طرف سناٹا تھا ۔ صرف اس کے سر کے اوپر مکان کے چھجے پر دو کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کر رہے تھے ۔ اُس کی آہٹ پا کر دونوں اُڑے اور پاس ہی ایک درخت پر جا کر بیٹھ گئے ۔ اُس نے مڑ کر مکان کا دروازہ بھیڑ دیا پھر کلہاڑی ہاتھ میں لیے لمبا سا آنگن طے کر کے مکان کے احاطے کے باہر نکل آیا ۔ باہر سڑک بھی سنسان پڑی تھی ۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ سارے میں اپنا راج منوا رہی تھی ۔ وہ سڑک پر چلنے لگا ۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے وہ مندر نظر آ گیا ۔ دھوپ میں مندر کے سنہری کلس سے کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں ۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑے دروازے سے مندر کے اندر داخل ہو گیا ۔ سامنے بڑے سے محراب میں بھگوان کی مورتی رکھی تھی ۔ پاس ہی دھوپ بتی جل رہی تھی اور بھگوان کے چرنوں میں ڈھیر سارے پھول پڑے تھے ۔ اس نے ایک نظر بھگوان کی مورتی پر ڈالی اور پھر چاروں طرف دیکھنے لگا ۔ مگر دھوپ سے اچانک اندھیرے میں آ جانے کی وجہ سے اُسے چند لمحوں تک کچھ سجھائی نہیں دیا ۔ جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو اُس نے دیکھا کہ مندر کے ایک کونے میں کوئی دُبک کر بیٹھا ہے ۔ وہ اپنی کلہاڑی کو مضبوطی سے تھامے اُسی طرف بڑھا ۔ یک بیک اس کے کانوں میں کسی کے گڑگڑانے کی آواز آئی ۔ "نہیں ، بھگوان کے لیے مجھے مت مارو ۔ میرا کوئی دوش نہیں تھا ۔ تمہی نے ، تمہاری پتنی نے ہی مجھے بلایا تھا ۔ میں خود سے وہاں نہیں گیا تھا ۔ بھگوان کے لیے مجھ پر رحم کرو ۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں ، پاؤں پڑتا ہوں ۔"

اس نے دیکھا کہ بھکاری اُس کے قدموں میں بڑی بُری طرح گڑگڑا رہا ہے جو چند منٹ پہلے اُس کی پتنی کے کمرے سے فرار ہوا تھا ۔ اُس نے کلہاڑی پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا ۔ وہ کتے کی طرح دُم ہلا رہا تھا اور سؤر کی طرح لوٹیں لگا رہا تھا ۔ اُس کی آواز سے ہزار بھکاریوں کی لجاجت ٹپک رہی تھی ۔ کلہاڑی پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ وہ چند لمحوں تک اُسے گھورتا اُس کی بلبلاہٹ دیکھتا رہا ۔ پھر اُس کی چُٹیا پکڑ کر اُس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا ۔ اُس کا پورا چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے تر تھا ۔

"آخ تھو ـــــ" اس نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ متواتر گڑگڑائے جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور مندر کے دروازے کی طرف چل دیا۔ بھگوان کی مورتی کے سامنے آکر ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ مورتی پر ایک نگاہ ڈالی پھر بڑے زہریلے لہجے میں بولا۔

"اگر دیکھ سکتا ہے تو دیکھ کہ میں نے اتنے غصے میں بھی تیرے گھر کو اس کے خون سے اپوتر نہیں کیا۔ مگر تو نے ......"

وہ جملہ پورا کرنے کے بجائے تھوڑی دیر تک مورتی کو گھورتا رہا، پھر مڑ کر مندر کے باہر نکل گیا۔ باہر اسی طرح سناٹے کی حکمرانی تھی۔ وہ گھوم کر مندر کے پچھواڑے آیا اور کھیتوں میں سے ہوتا جنگل کی راہ ہو لیا۔

سردی کے ساتھ اسے اب تھکن کا بھی احساس ہو رہا تھا اور کہیں رک کر ذرا کمر سیدھی کرنے کو اس کا جی بری طرح مچل رہا تھا۔

راستے میں اسے دور سے دھواں سا اٹھتا دکھائی دیا۔ شاید کوئی بستی ہے۔ بستی میں جائے کہ نہ جائے اس کے ذہن میں کشمکش سی ہونے لگی۔ صرف ایک رات کے لیے یہاں رکنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کہیں سے کچھ کھانے کو بھی مل جائے۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ صبح ناشتہ ایک لسی کا گلاس پی کر وہ گھر سے نکلا تھا۔ دوپہر کو گھر لوٹنے سے پہلے اس نے سوچا تھا۔ گھر پہنچ کر ڈٹ کر کھانا کھائے گا۔ ایک گلاس چھاچھ چڑھائے گا اور آنگن میں درخت کے نیچے چارپائی ڈال کر لیٹ جائے گا۔ بیوی اس کے پاؤں دبائے گی، سر میں تیل ڈال کر مالش کرے گی اور وہ لمبی تان کے سو جائے گا۔

مگر جب وہ گھر پہنچا تو ...... ہش ـــــ اس نے گردن کو ایک جھٹکا دیا جیسے وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا ہو جو کسی مردار خور کتے کی طرح رہ رہ کر اس کے ذہن میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جیب سے شکرقندی کا ایک ٹکڑا نکال کر دانتوں سے تھوڑا سا کتر کر پھر جیب میں رکھ لی۔ اگر راستے میں یہ شکرقند کا کھیت نہ مل گیا ہوتا تو وہ بھوکوں ہی مرتا۔ شام کو جب سائے لمبے ہونے لگے تھے اسے شکرقند کا کھیت دکھائی دیا اور تبھی سے بھوک کا احساس بھی ہوا تھا۔ اس نے جھک کر شکرقند کی چند گانٹھیں کھود نکالیں۔ دو چار وہیں چبا ڈالیں اور کچھ اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں کہ راستے میں کام آئیں گی۔

چلتے چلتے اب دھوئیں کے ساتھ آگ کی لپٹیں بھی دکھائی دینے لگیں۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے محسوس ہوا کہ وہاں کوئی بہت بڑا الاؤ جل رہا ہے۔ جس سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ آگ کو دیکھتے ہی اسے سردی کا شدید احساس ہوا۔ اب اس کے قدم تیزی سے الاؤ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ جلد از جلد آگ کے قریب پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر ساتھ ہی کسی پیش آنے والے غیر متوقع خطرے کے خوف سے اس نے کلہاڑی کو کمر سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اب الاؤ کے قریب آ چکا تھا۔ تبھی اس نے دیکھا۔ وہ جس آگ کو الاؤ سمجھ رہا تھا وہ الاؤ نہیں کسی کی چتا ہے۔ آگ کی لپٹوں میں لاش کے ڈھانچے کے مبہم سے خطوط اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اور فضا میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے چٹکی سے اپنی ناک پکڑ لی اور کلہاڑی ہاتھ میں لیے چتا کے بالکل قریب آ گیا۔ اسے سب سے پہلے اپنے چہرے پر آگ کی تمازت محسوس ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح اپنی ناک کو چٹکی میں پکڑے کھڑا رہا۔ آگ کی گرمی دھیرے دھیرے اس کے مساموں میں اترنے لگی۔ اور اسے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ نزدیک و دور کوئی نہیں تھا۔ آگ کی اٹھتی لپٹوں کی روشنی میں اسے وہاں ادھر ادھر پیڑوں کی چند بکھری ہوئی پتیاں دکھائی دیں ورنہ بس۔ وہ چتا کے پاس ہی ایک مناسب جگہ تلاش کر کے اکڑوں بیٹھ گیا۔ کلہاڑی کو کمر سے نکال کر اپنے پاس ہی رکھ لیا اور دونوں ہتھیلیاں آگ پر تاپنے لگا۔ تھوڑی دیر تک آگ تاپنے کے بعد اسکے بدن میں کافی حرارت آ گئی اور چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے سوچا کہ رات اسی چتا کے پاس گزارنی پڑے گی۔ پہلے تو اسے عجیب لگا کہ چتا کے پاس اسے نیند کیونکر آئے گی۔ مگر یہاں سے اٹھ کر اس جنگل میں وہ کہاں جایا جا سکتا ہے ممکن ہے پاس ہی کہیں کوئی بستی ہو مگر بستی میں جا کر شب بسری کے لیے کسی کے آگے کیوں التجا کرے۔ نہیں اب وہ کسی سے کچھ نہیں مانگے گا۔ کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ اس کے سارے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں۔ اور اگر کہیں کوئی تسمہ بندھا ہوا رہ بھی گیا ہو تو وہ خود اسے کاٹ دے گا۔ اس کا اب کسی سے کوئی رشتہ نہیں کوئی تعلق نہیں۔ وہ کلہاڑی کو سرہانے رکھے چتا کے سامنے لیٹ گیا۔ اس کی جیب میں پڑی شکر قند کی گانٹھیں زمین پر گر گئیں۔ اس نے ایک گانٹھ اٹھائی اسے کتر کتر کر کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے معاً اسے خیال آیا کہ شکر قند کو بھون کر بھی کھایا جا سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے چتا کی جانب دیکھا۔ لاش سے شعلے اب دھندلا گئے تھے۔ تقریباً ساری لاش جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

کہ وہ شکر قند کو اس چتا میں بھون کر کھائے۔ اب گوشت کی بو بھی اسے اتنی ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور چتا سے ایک ادھ جلی لکڑی اٹھالی پھر اس لکڑی سے دو تین انگارے کھینچ کر اپنے قریب کر لیے اور شکر قند کی گانٹھ کو ان انگاروں پر بھوننے لگا۔ بھونے ہوئے شکر قند کا مزہ کچھ اور تھا۔ دو تین شکر قند حلق سے اتارنے کے بعد اس نے سکون سے کلہاڑی کو سینے پر ہی رکھا اور پاس ہی پڑے ایک پتھر کو سرہانے رکھ کر چتا کے پاس ہی دراز ہو گیا۔ سر پر تاروں بھرے آسمان کی چادر تنی تھی اور اس کے چاروں طرف دنیا پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جھینگروں کی مسلسل چہائیں چہائیں سے اس کے کان آشنا ہوتے جا رہے تھے۔ رہ رہ کر چتا میں کسی لکڑی کے چٹخنے کی آواز پر وہ آنکھیں کھول کر ادھر ادھر ضرور دیکھ لیتا۔

آنکھیں بند کرتے ہی وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ وہی کتابی چہرہ، روشن پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ جن کے درمیان بہت خفیف سی لکیر بے حد خوبصورت لگ رہی۔ وہ آئی اور چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ اس کا سر دبانے لگی۔ سر دباتے دباتے اس نے جھک کر اس کے ہونٹ چوم لیے اور اس نے بے ساختہ اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ تبھی اسے لگا کہ اس کی گردن کے گرد چڑیل کا شکنجہ کی گرفت سخت ہوتی جا رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے ہاتھوں کو اپنی گردن سے علیحدہ کیا۔ مگر اس کی بیوی کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔ دو سرخ باچھوں سے دو لمبے لمبے دانت جھانک رہے تھے اس کے بال کھل کر اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے اور وہ کسی چڑیل کی طرح ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ پھر یک لخت اس نے اس کی گردن میں اپنے لمبے لمبے دانت پیوست کر دیے اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے چتا اسی طرح سلگ رہی تھی اور چاروں طرف اندھیرا پہلے کی طرح گھپ تھا۔

"ڈائن ــــ" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے۔ اور سینے پر ہاتھ سے اپنی کلہاڑی ٹٹولنے کے بعد دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رات بھر اسے اسی طرح کے عجیب عجیب خواب آتے رہے۔ ذرا آنکھ جھپکتی کہ کسی نہ کسی سیدھے خواب سے نیند اچٹ جاتی۔ ذرا سی آہٹ ہوتی اور وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ کیا اب وہ زندگی بھر یوں ہی کسی جانور کی طرح وحشت زدہ رہے گا۔ یہ وحشت زدگی، چھنو سے کا رد عمل

تو نہیں؟ کیا وہ اپنے کیے پر نادم ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ اس نے جو کچھ کیا صحیح کیا۔ اس کے سو وہ اور کیا کر سکتا تھا۔ جس نے اس کے یقین و اعتبار کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ جس نے اس کی چاہت کا مذاق اڑایا تھا، جس نے اس کے وجود کی نفی کر دی تھی، اُسے وہ معاف نہیں کر سکتا تھا۔ ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔

مگر اس نے ایسا کیوں کیا۔۔ اس سوال پر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگتا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا ہوگا۔ اسے کتنا چاہتا تھا وہ۔ اس کی خوشی کی خاطر وہ آسمان سے تارے توڑ کر لانے کا عزم رکھتا تھا۔ وہ بھی تو اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ تو کیا وہ سب، دکھاوا تھی، محض دکھاوا تھا۔ اس کے پیٹ میں پھر ایک زبردست خلا سا پیدا ہونے لگا۔ اور وہ بے حد مضطرب ہو گیا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ چٹ، چٹا میں کوئی لکڑی چٹخی اور پاس کے درخت پر ایک پرندہ پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ وہ چت لیٹ گیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم اُداس کیوں ہو! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"کون؟"

"میں ہوں۔" اس کی نیم کھلی پلکیں اس کے چہرے پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ اس نے باہیں پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں لے لینا چاہا، مگر وہ ہنستی ہوئی اس سے دور ہٹ گئی۔ دور کہیں چاندی کی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ وہ ایک طرف کھڑی متواتر ہنسے جا رہی تھی۔ ٹن۔ ٹن، مندر کا گھنٹہ بجا اور ایک طرف سے پجاری نمودار ہوا۔ گلے میں جنیو، ماتھے پر تلک اور ہاتھ میں تسبیح، اس کے سیاہ فام جسم پر صرف ایک سفید دھوتی تھی۔ وہ ہرے رام ہرے رام کرتا ہوا بڑھا اور وہ کھل کھلاتی ہوئی ٹوٹی کھکڑ (؟) کی طرح اس کی باہوں میں سما گئی۔ اس کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ اور وہ دونوں ہم آغوش ہو گئے۔ اس نے اسے پکارنا چاہا مگر اس کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں کو علیحدہ کرنا چاہا مگر اس کے قدم زمین میں دھنس گئے۔ سامنے کلہاڑی پڑی تھی۔ اس نے جھک کر کلہاڑی کو اٹھا لیا اور پوری قوت سے ان کی طرف پھینکا۔ فضا میں ایک دلدوز چیخ گونجی اور اس نے پھر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

چتا کے شعلے اب سرد پڑ چکے تھے۔ مگر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے انگاروں کی سرخی دکھائی

دے جاتی۔ مشرق کی جانب سے سپیدۂ صبح نمودار ہو رہا تھا۔ درختوں پر پرندوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک انگڑائی لی اور منہ چلاتا ہوا ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ صبح کاذب کے دھندلکے میں ہر شے غیر واضح، پُراسرار اور ہیبت ناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کلہاڑی ہاتھ میں لے لی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کلہاڑی کو کمر میں کھونسا اور چتا کے پاس سے ہٹ گیا۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس نے گردن اوپر اٹھا کر ایک گہرا سانس لیا۔ اب اچھا خاصا اُجالا پھیل چکا تھا اس نے چاروں طرف دیکھا اور اپنے اگلے سفر کی راہ متعین کرنے لگا۔ پیچھے وہ پگڈنڈی تھی جس پر چل کر وہ کل رات یہاں تک پہنچا تھا۔ اور سامنے گھنا جنگل بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرف قدم اٹھائے اتنے میں اسے کسی کے پیروں کی ہلکی چاپ سنائی دی اُس نے مڑ کر دیکھا، ایک عورت چتا کے پاس کھڑی تھی۔ عورت سیاہ ساڑی میں ملبوس تھی اور اس کے بال کھل کر اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے۔ اس کا گول مٹول چہرہ سیاہ بالوں اور سیاہ ساڑی میں سفید کنول کی مانند کھلا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک چتا کے پاس چپ چاپ کھڑی رہی پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔ اُسے بڑا تعجب ہوا، کون ہے یہ عورت؟ مرنے والے کی کیا لگتی ہے یہ؟ اور اس جنگل میں تنہا چتا کے پاس کیوں آئی ہے؟ پھر اسے اپنی بیوی یاد آ گئی اور اس نے کلہاڑی کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

"بدذات!" اس نے دانت پیس کر کہا۔ اور چند قدم آگے بڑھ کر عورت کے قریب پہنچ گیا۔ آہٹ پا کر عورت نے اپنے چہرے سے دونوں ہاتھ ہٹا لیے اور اس پر نظر پڑتے ہی حیرت اور گھبراہٹ کی ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔

"کون ہو تم؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بتاؤ کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟"

عورت نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"بتاتی ہو یا ——— ؟" اس نے کمر سے کلہاڑی نکال کر سر بلند کر لی۔

"نہیں ———" عورت نے سہم کر کہا۔

" پھر بتاؤ تم کون ہو؟"

" میں ـــــ میں ـــــ اس شخص کی بیوی ہوں۔"

" بیوی ـــــ ؟" اس نے تعجب سے دہرایا۔

" ہاں، مرنے والا شخص میرا شوہر تھا۔"

" مگر اتنی صبح صبح تم اس کی چتا پر کیوں آئی ہو؟"

میں خود بھی اب اسی چتا میں جل کر مر جانا چاہتی ہوں۔"

" کیوں! کیا تمہیں اپنے شوہر سے اتنی محبت تھی؟"

اس کی آواز میں لرزش تھی اور اس کا کلہاڑی والا ہاتھ نیچے جھول گیا تھا۔

" نہیں ـــــ یہ بات نہیں، میں اپنے پاپ کا پرائشچت کرنا چاہتی ہوں۔"

" پرائشچت ـــ ؟"

" ہاں ـــــ "

" مگر تم نے کیا پاپ کیا ہے؟"

" ایک شرط پر میں اپنا پاپ تمہیں بتا سکتی ہوں۔"

" کیسی شرط۔"

" مجھے جنگل سے اتنی لکڑیاں کاٹ کر لا دو کہ میں اس چتا پر ایک دوسری چتا سجا کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دوں۔"

" لا دوں گا ـــــ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کیا پاپ کیا ہے؟"

" یہ میرا شوہر تھا اور میں نے اسے زہر دیا تھا۔"

" زہر دیا تھا؟ تم نے۔"

" ہاں ـــــ "

" مگر کیوں؟"

" کیوں کہ یہ بے وفا تھا۔ گھر میں میری محبت کا دم بھرتا تھا اور باہر ایک دوسری عورت کے ساتھ گلچھڑے اڑاتا تھا۔"

" اوہو ـــــ" وہ یکلخت خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سر نیوڑھائے کچھ سوچتا رہا۔

پھر گردن اٹھا کر اس عورت کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ عورت چتا میں جلتے بجھتے انگاروں کو دیکھ رہی تھی، جو اب ڈھیر سے راکھ ہوتے جا رہے تھے۔ عورت واقعی خوبصورت تھی۔ سیاہ ساڑھی میں اس کا حسن لشکارے مار رہا تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

"تو واقعی تم مر جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں ــــ"

"مگر ابھی تم کہہ چکی ہو کہ تمہارا شوہر بے وفا تھا۔ پھر تم اس بے وفا کے ساتھ چتا میں جل کر کیوں مر جانا چاہتی ہو؟"

"اس لیے کہ اب میرا زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے دنیا میں سب سے زیادہ اعتبار اپنے شوہر پر کیا تھا۔ جب وہی بے وفا نکلا تو اب میں کس پر اعتبار کروں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہارے لیے لکڑیاں اکٹھی کر دوں گا۔"

"اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور اتنے سویرے اس شمشان میں کیا کر رہے ہو؟"

"تم نے مجھ سے سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا ہے، اس لیے میں بھی تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

وہ رک گیا۔ وہ چپ چاپ اس کی جانب دیکھتی رہی۔ "دراصل کل دوپہر کو میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ اور اب یہاں سے بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟ تم نے اپنی بیوی کا قتل کیوں کر دیا؟"

"کیونکہ وہ تمہارے شوہر کی طرح بے وفا تھی۔"

"اوہ" عورت یکلخت خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر گردن اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ کلہاڑی کے دستے کو مضبوطی سے پکڑے چتا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کی پیشانی پر جھول آئے تھے۔ اس کا قد لمبا اور جسم گٹھیلا تھا۔ ہر چند کہ اس کا چہرہ غبار آلود تھا مگر چہرے کے تیکھے نقوش نمایاں تھے۔ ہلکی ہلکی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی نکیلی مونچھیں اس کے چہرے کو بارعب بنا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ پتلے اور ٹھوڑی مضبوط تھی۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں کافی توی تھیں۔ اس نے جوتے کی نوک سے ایک پتھر کو ٹھوکر مار کر اچھال دیا اور یک بیک نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور عورت نے سٹپٹا کر پلکیں جھکا لیں۔

اس نے آگے بڑھ کر عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"سنو! زندگی بڑی قیمتی شے ہے اسے یوں ضائع کرنا عقلمندی نہیں۔ تم نے جو کچھ کیا اس پر پچھتانا بیکار ہے۔ جاؤ اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔"

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اب میں چلتا ہوں ــــ" اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"جنگل میں ــــ کیونکہ بستیاں میری دشمن ہو چکی ہیں۔ اب جنگل ہی میری پناہ گاہ ہے۔"

وہ جنگل کی طرف مڑ گیا۔

ابھی دو قدم بھی نہیں چلا تھا کہ پیچھے سے عورت کی آواز آئی ــــ "اجنبی ٹھہرو۔"

وہ رک گیا۔ رک کر مڑا۔ اور عورت کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ آؤں گی۔"

"تم جنگل میں میرا ساتھ دے سکو گی۔"

"ہم لوگ شاید جنگل ہی میں ایک دوسرے کا ساتھ دے سکتے ہیں۔"

عورت نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس نے اس کی نازک انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دیں۔ جنگل میں داخل ہونے سے پہلے وہ رک گیا۔

"ٹھہرو ــــ جب جنگل ہی کو اپنا ٹھکانہ بنانا ہے تو پھر ان کپڑوں کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے اپنے کپڑے اتار دیئے۔ عورت بھی بلا پس و پیش بے لباس ہو گئی۔ دونوں نے اپنے کپڑے چتا پر اچھال دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کپڑوں سے شعلے اٹھنے لگے۔

اس نے ایک ہاتھ میں کلہاڑی سنبھالی اور دوسرا ہاتھ عورت کی کمر میں ڈال دیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور جنگل میں داخل ہو گئے۔ ●●